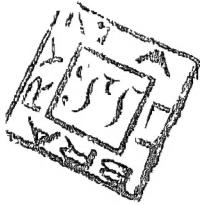




1185



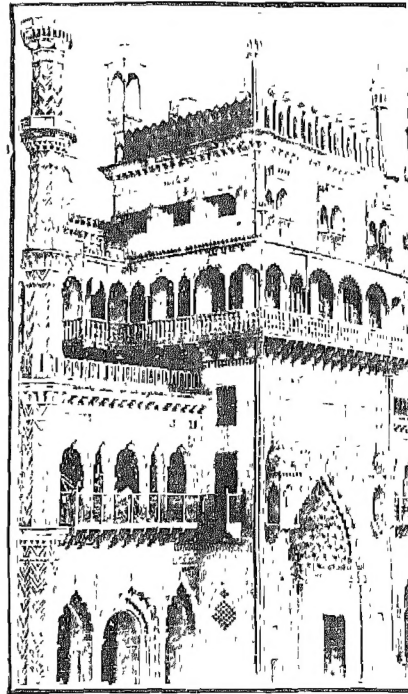
بشیر پاشا سیریز

تذکرہ

شمس العلماء خواجہ حالی مرحوم

مرتبہ

محمد امین زبیری



اسلامیہ ہائی اسکول (اٹا وہ)



M.A.LIBRARY, A.M.U.



U32709

تعاون

۲۰۹

میں اس سلسلہ کو اپنے شاگرد رشید جوان مرگ
 بشیر پاشا مرحوم بی۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ کے نام سے مٹھون
 کرتا ہوں جس کی زندگی اور جس کی تعلیم و تربیت کا مقصد
 قوم کی تعلیمی خدمت تھی اور جس نے تکمیل تعلیم کر کے اپنی
 زندگی کو اسلامیہ ہائی اسکول اٹارہ کے لئے وقف کر دیا تھا۔

محمد الطاف حسین

^9100019^

0000

(0000) 0000

تذکرۃ المشاہیر

نوجوانان قوم میں ملک اور قوم کی خدمتوں کا جذبہ پیدا کرنے اور ان کے توجہ بڑھانے کے لیے مشاہیر قوم کی سوانح عمریوں کا مطالعہ جنہوں نے اپنے ملک اور اپنی قوم کی ترقیوں میں جانفشانی کی ہے نہایت مؤثر ذریعہ ہے اور ہر ملک اور ہر قوم میں اس ذریعہ کو فائدہ اٹھایا جاتا ہے اور علم الرجال کی بڑی بڑی سوانح عمریوں کے علاوہ خوشناما سائز اور عمدہ طباعت کے ساتھ کم قیمت لائف ایکنج ہکشرٹ شائع کئے جاتے ہیں۔ لیکن ہندوستان میں مسلمانوں نے اس ذریعہ کو کچھ توجہ نہیں کی حالانکہ دوسری قومیں اسی ذریعہ سے بہت کچھ منافع حاصل کر رہی ہیں اسی مقصد کو پیش نظر رکھ کر میں نے اور مولوی بشیر الدین صاحب فیض اسلام آباد کی ہائی اسکول انارڈہ فی ارادہ کیا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو اس عصر جدید میں جن مشاہیر نے اپنی عمر میں قومی خدمت اور ہمدردی میں صرف کی ہے ان کے لائف ایکنج شائع کئے جائیں۔ چنانچہ اس وقت اس سلسلہ کے چند نمبر شائع کئے جاتے ہیں اور میں ان عزیزوں اور دوستوں کا شکریہ ادا ہوں جنہوں نے ہماری دلی خواہش کی تکمیل اپنا وقت صرف کر کے اور محنت اٹھا کر ان تذکروں کو مرتب کیا ہے جو خداوند تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے اور ہم کو اپنے ارادہ میں کامیاب کرے۔

میں اپنے پوجش نوجوان دوست سید عبدالجلیل صاحب کو بمبئی میں فن طباحت کی تکمیل کر رہے ہیں خاص طور پر شکر گزار ہوں کہ انہوں نے نہایت تنگ وقت میں تصاویر کے لیے اچھے اور عمدہ ہلاک خود تیار کر کے بطور امداد عنایت کئے اور اپنی نگرانی میں ان کو طبع کرایا۔

میں اپنے اہل قلم نوجوانان قوم سے استدعا کرتا ہوں کہ وہ اس قومی خدمت میں ہماری مدد کر کے عند اللہ ناجور ہوں۔ اس سلسلہ کی اشاعت سے اگر کچھ فائدہ ہو تو اسی سلسلہ کی توسیع میں صرف ہوگا۔

محمد امدان حسین بی اے۔

ہیڈ ماسٹر اسلام آباد ہائی اسکول

(شمسی شین پریس لاہور میں خدمت بشیر الدین صاحب نے تمام چھاپا گیا)

شمس العلماء تواجہ حافظ الطاف حسین صاحب جالی

(۱)

مولانا حاتی بانی پت کے ایک مشہور عالی نسب انصاری خاندان کے رکن اور تواجہ ایزد بخش کے فرزند اصغر تھے۔

ان کی ولادت ۱۳۴۷ھ میں ہوئی تھی اور ہنوز ۵ سال کی عمر ہی پر ہی نہ کی تھی کہ پہلے باپ کے ظل عاطفت سے اور پھر ماں کی آغوش شفقت سے محروم ہو گئے۔ لیکن ان کے بڑے بھائی تواجہ امداد حسین نے باپ سے زیادہ شفقت کے ساتھ ان کی پرورش کی اور تعلیم و تربیت پر توجہ رکھی۔ سب سے پہلے قرآن مجید حفظ کرایا گیا اور پھر درسی کتابیں شروع ہوئیں۔

مولانا نے فارسی کی تعلیم سید جعفر علی صاحب سے حاصل کی جو میرمنون دہلوی کے بھتیجے تھے اور فارسی میں اس کا دستگاہ اور محارتا تارہ رکھتے تھے۔ تعلیم مذہبی اور عربی کی تکمیل مولوی حاجی ابراہیم حسین ۵۱ میں مولوی عبدالرزاق صاحب مہتمم تاریخ تمدن اسلام بھوپال و مصنف الہدایہ و نظام الملک طوسی کا ہے انھما شکر گزار ہیں کہ جناب مولانا نے متعدد درجہ و درجات لکھوا کر ذکر کی تکمیل میں امداد دی۔

صاحب انصاری اور حاجی قاری مولوی عبدالرحمان صاحب انصاری
سے کی قاری صاحب جید عالم اور محدث تھے اور قرآن مجید کا خاص طور
درس دیتے تھے۔

۱۷۔ سال کی عمر میں مولانا کی شادی اپنے کنبے قبیلے میں ہو گئی
پس اتفاق تھا کہ سسرال کی خوشحالی کے باعث متبادلہ زندگی
کے ترددات سے ان کو سابقہ بغض پڑا اور ان کی تعلیم کا سلسلہ برابر
جاری رہا۔ اسی سلسلہ میں کچھ عرصہ دھلی میں بھی بسر کیا۔ دھلی
میں اگرچہ مسلمانوں کی عظمت و شوکت اور علم و فضل کا آفتاب ڈوبا
چکا تھا تاہم شفقت کی کچھ روشنی باقی تھی اور اہل علم و فضل اور صاحبان
کمال کا مجمع موجود تھا مولانا نے ان علماء و فضلاء سے علمی
استفادہ کیا۔

فطرت نے ان کے خمیر میں ان جوہروں کو بھی ودیعت کیا تھا جن سے
السان اصلی شاعر بنتا ہے لیکن کتاب علوم کے زمانہ تک وہ جوہر
چھپی رہے۔ جب اس سے فارغ ہوئے تو باکمال ارباب سخن کی
صحبتوں نے ان جوہروں کو بھی چمکایا اور مشق سخن کا آغاز ہوا۔

اس کی نسبت خود مولانا نے کانپور میں مولوی عبدالرزاق صاحب سے
فرمایا تھا کہ ”قلعہ معلّے کے دیوان عام میں جو مشاعرہ ہوتا تھا وہاں میں نے

غالب کو فارسی اور اردو غزلین پڑھتے سنا اس سے مجھے شاعری کا شوق ہوا۔

لیکن یہ صحبتیں اکتسابِ معاش کی فکر کی وجہ سے جلد ختم ہو گئیں اور مولانا ۱۸۵۶ء میں ضلع حصار میں ملازم ہو گئے جس کو ۱۸۵۷ء کی پریشانیوں میں ترک کرنا پڑا اور اس عام پریشانی اور دروگیر کے چند سال منطق و فلسفہ اور حدیث و تفسیر کی تکمیل میں گزارے اس کے بعد انھوں نے نواب محمد مصطفیٰ خاں کے بچوں کی تعلیم اور اتالیقی منظور کی اور ۱۸۶۳ء سے ۱۸۷۱ء تک جھانگیر آباد میں قیام رہا۔ نواب صاحب کی صحبت میں شعر و سخن کی ابتدا ہوئی اور جو کچھ لکھا اُس پر نواب صاحب نے اصلاح دی۔ لیکن قیام جھانگیر آباد کے زمانہ میں ہی غالب سے تلمذ حاصل کیا اور مستقل طور سے ان سے اصلاح لیتی شروع کی۔ مرزا غالب اپنے سرمایہ

۱۵ دہلی کے رئیس اور جھانگیر آباد ضلع بلند شہر کے تعلقہ دار تھے۔ اردو میں

شیفہ اور نازسی میں حسرتی تخلص کرتے تھے۔ مفتی صدر الدین خاں اردو، نواب محمد

ضیاء الدین خاں "نیر و خشاں"، اور مرزا غالب کہ ہم جلس اور ہم صحبت تھے۔ واقعہ

کے بعد دہلی کی سکونت ترک کر دی اور جھانگیر آباد میں رہتے تھے۔

۴۷
 فخر شاگرد کی سخن فہمی، قابلیت علمی اور جودت و ذکاوت کی بہت قدر کرتے تھے اور شاگرد کے دل میں اپنے استاد کا انتہائی احترام اور شفیقتی و گرویدگی تھی۔ اور یہی اثر غالب کے مرثیہ میں سونوار کی صورت میں نمایاں ہے۔

(۲۲)

جھانگیر آباد کی ملازمت ترک کرنے کے بعد گورنمنٹ پمپا کے دارالکتب میں مامور ہو گئے تھیں یہ خدمت سپرد تھی کہ کتابوں کی عبارت زمانہ حال کے مذاق کے مطابق درست کریں لیکن اس زمانہ میں یہاں ایسی سوسائٹی نہ تھی کہ ان کا دل لگتا دھلی کے ارباب کمال کی صحبتوں کی یاد ہمیشہ مضطرب رکھتی تھی اس لئے وہ پریشان رہتے تھے۔ آخر یہ پریشانی دور ہوئی اور پھر وہ انیکلوپڈیا اسکول دھلی کی مدرسہ پر مامور ہو کر دھلی میں ہی آگئے، مگر قسمت پھر لاہور لے گئی اور ایک چھپن کلن میں متعین ہوئے اب لاہور میں

غالب کے انتقال کے دن جو ۲۰ ذی قعدہ ۱۲۸۵ مطابق فروری ۱۸۶۹ء کو ہوا مولانا حالی۔ مرزا قریب علی بیگ ساکب، میر جہدی بھرج تینوں شاگرد موجود تھے اور تجھیز و تکفین میں شریک ہوئے اور تینوں نے مرثیہ بھی لکھے لیکن مولانا حالی کا مرثیہ بہت پر درد اور بلند ہے۔

۵۵
ارباب کمال کی سوسائٹی بھی قائم ہو گئی تھی۔

مولانا کو مشقِ سخن شروع کرنے کے تھوڑے عرصہ بعد ہی صوف
شعرا میں امتیازی جگہ مل گئی تھی مگر جب کرنل ہارلڈ ڈائمر کٹر
تعلیمات پنجاب نے لاہور میں ایک مجلسِ مشاعرہ قائم کی جس میں
بجائے مصرعہ طرح کے کسی خاص عنوان پر شعرا کو طبع آزمائی
کا موقع دیا جاتا تھا اور اس میں مولانا نے قدیم رنگ کو چھوڑ کر
یرکھارت، نشاطِ امید، مناظرہ رحم و انصاف، حب وطن کے
نام سے جدید طرز کی نظمیں پیش کیں جو جذبات کا مرقع اور واردا
حالیہ کا آئینہ تھیں تو ان نظموں نے مولانا کا درجہ اپنے ہم نشینوں
سے بھت بلند کر دیا۔ لیکن رفعت و کمال کے یہ ابتدائی مدارج
تھے۔ وہ جو ہر جو قدرت نے ان کو عطا کئے تھے ابھی تک جلوہ نگاہ
عام پر نہ آئے تھے۔

(۳۵)

۴۷
شاعر کے بعد ان کی طبیعت پر ایک قسم کی افسردگی
طاری ہو گئی تھی اور شعر و سخن سے دل پھیکا ہو گیا
تھا ان کے دل پر ہر سید کی ملاقات سے ایک عجیب اثر پڑا اور اسی
اثر سے وہ جو ہر اس طرح چمکے جیسے پردہ شب سے آفتاب عالم تاب

٦
 نمایان ہوتا ہے جس کا سب سے پھلا کر شمع ”درد و جزر اسلام“، عقا
 جس نے حالی کے نام کا سکھ ہر ایک مسلمان کے دل پر قائم کر دیا۔
 یہ مسدس ۱۸۷۹ء میں ختم ہوا اور مولانا نے خود ہی اس کو
 طبع کرا کے سپرد کے پاس بھیجا۔ سر سید نے اس کی رسید میں جو
 خط مولانا کے نام بھیجا تھا جس کو اس مسدس کا تبصرہ اور مولانا
 کی محنت و جان لکھا ہی کا ایک قابل قدر اعتراض لکھا جاسکتا ہو
 وہ یہ تھا کہ :-

جناب مخدوم دکر مہن! عنایت نامہ جات مع پانچ جلدیں
 پہنچے جس وقت کتاب ہاتھ میں آئی جب تک ختم نہ ہوئی ہاتھ
 سے نہ چھوئی اور جب ختم ہوئی تو افسوس ہوا کہ کیوں ختم ہو گئی
 اگر اس مسدس کی بدولت فن شاعری کی تاریخ جدید قرار
 دی جائے تو بالکل بجا ہے۔ کس صفائی اور خوبی سے
 یہ نظم تحریر ہوئی ہے۔ بیان سے باہر ہے۔ تعجب ہوتا کہ
 کہ ایسا واقعی مضمون جو مبالغہ جھوٹ، تشبیہات دور از کار سے
 جو ایہ ناز شعرا و شاعری ہے بالکل بڑا ہے۔ کیونکہ ایسی خوبی و خوش
 بیانی اور موثر طریقہ برادار ہوا ہے۔ متعدد بند اس میں ایسے ہیں جو
 بے چشم نم پڑے نہیں جاسکتے۔ حق ہے جو دل سے نکلتی ہے دل میں

بیٹھتی ہے۔ نثر بھی نہایت عمدہ اور نئے ڈھنگ کی کی ہے۔ پیرانی
 شاعری کا خاکہ نہایت لطف سے اڑایا ہے یا ادا کیا ہے، میری
 نسبت جو اشارہ اس نثر میں ہے اس کا شکر کرتا ہوں اور آپ کی
 محبت کا اثر سمجھتا ہوں۔ اگر پیرانی شاعری کی کچھ بو اُس میں
 باقی جاتی ہے تو صرف انہی الفاظ میں ہے۔ جن میں میری طرف
 اشارہ ہے۔ بیشک میں اس کا محرک ہوا اور اس کو میں اپنے
 اُن اعمال میں سے سمجھتا ہوں کہ جب خدا پوچھے گا
 کہ تو کیا لایا میں کہو گا کہ حالی سے سدس لکھوالا یا ہوں
 اور کچھ نصیحتیں، خدا آپ کو جزائے خیر دے اور قوم کو اس سے
 فائدہ بخٹے۔ مسجدوں کے اماموں کو چاہیئے کہ نمازوں میں
 اور خطبوں میں اسی کے بند پڑا کریں۔ آپ نے یہ نہیں ارتقا
 فرمایا کہ کس قدر کتابیں چھپی ہیں اور کیا لاگت لگی ہے اور نئی
 کتاب کیا قیمت مقرر کی ہے نہایت جلد آپ ان جملہ امور سے
 مجھے مطلع فرمائے یہ بھی لکھئے کہ بعد تقسیم یا فروخت کس قدر
 کتابیں اب موجود ہیں۔

آپ کے اس خیال کا کہ حق تصنیف مدرسۃ العلوم کو دیا
 جاوے اور رجسٹری کرادی جاوے میں دل سے شکر کرتا ہوں

مگر میں نہیں چاہتا کہ اس سس کو جو قوم کے حال کا آئینہ اور ان
 کے اقوم کا مرئیہ ہو کسی قید سے مقید کیا جاوے جس قدر چپے
 اور جس قدر وہ مشہور ہوا اور لڑکے ڈنڈوں پر لگائے پھیریں اور
 رنڈیاں مجلسوں میں طلبہ سارنگی پر گاوین، قوال درگاہوں
 میں گاوین۔ حال لانے والے اس سچے حال پر حال لاوین
 اسی قدر مجھ کو زیادہ خوشی ہوگی۔ میرا تو دل چاہتا ہے کہ دہلی
 میں ایک مجلس کروں جس میں تمام اشرف ہوں اور
 رنڈیاں بچواؤں مگر وہ رنڈیاں بھی سس گاتی ہوں۔ میں اس
 کل سس کو تہذیب الاخلاق میں چھاپوں گا۔ میرے
 ان استفسارات کا جواب جن پر نشان درج کر دیا ہے بہت جلد
 مرحمت ہوگا والسلام۔

خاکسار آپ کا احسان بندتا بعداً

سید احمد

شملہ۔ پارک ہوٹل۔ ۱۰ جون ۱۹۰۶ء

۹
 اس مسدس نے چند ہی سال کے اندر اطراف و اکناف ملک
 میں وہ شہرت و قبولیت حاصل کی کہ آج تک ہندوستان میں
 کسی انسانی کتاب کو بغیب نہیں ہوئی۔ مولود شریف کی
 مجلسوں میں جا بجا اس کے بند پڑے جاتے ہیں۔ اور
 واعظوں کی زبان پر اس کے اشعار جاری رہتے ہیں
 اکثر لوگ اس کو پڑھ کر بے اختیار روئے اور آنسو بھاتے ہیں
 تقریروں اور تحریروں میں اثر اور دل چسپی پیدا کرنے کے
 لیے اس کے بند کے بند استعمال ہوتے ہیں اور اس میں
 شک نہیں کہ اس مسدس نے مسلمانوں کے تاریک دل
 و دماغ کو منور کر دیا ان کے مردہ احساسات میں روح پیدا
 ہو گئی اور خفتہ جذبات بیدار ہو گئے۔ گزشتہ اور موجودہ
 حالات کا مرقع سامنے رہنے لگا اور یہ حقیقت نفس الامری
 ہے کہ سر سید کے مشن کو اس دو درجہ اسلام نے وہ تقویت
 دی کہ اگر اس زمانہ کے تمام لڑکچہ کیلئے اس کا موازنہ کیا جائے
 تو اسی کا پلہ بھاری ہو گا۔

اس مسدس نے اس طبقہ پر بھی اثر ڈالا جو سر سید سے
 وحشت کرتا تھا اور دور بھاگتا تھا یا جو مخالف تھا اور سید کی

کوششوں کا رد عمل کرتا تھا۔

تقریباً نصف صدی گزرنے پر بھی اسکی قبولیت میں کوئی فرق نہیں آیا صد ہا مرتبہ شایع ہوا اور ہنوز اشاعت کا سلسلہ برابر جاری ہے۔ بعض قومی مدارس میں اس کا انتخاب بچوں کو پڑھایا جاتا ہے۔ ممالک متحدہ کے سرکاری مدارس میں عام قبولیت کی وجہ سے نصاب تعلیم میں داخل رہا۔

مولانا نے پھر چھ برس بعد مقتضائے حال کے موافق ایک ضخیمہ کا اضافہ کیا جس میں یایوسی کی جگہ امید کی جھلک تھی اس مدرس کی قبولیت طبقہ وسط اور طبقہ غربا ہی تک نہیں ہے بلکہ امرا کے محلوں اور والیان ملک کے ایوانوں میں بھی اس کا نغمہ برسوز سامعہ نواز ہے۔ علیا حضرت نواب سلطان جہان بیگم صاحبہ تاج ہند جی، سسی، ایس، آئی، جی، سسی، آئی، اسی، جی، بی، اسی، فرمانروائے بھوپال نے

۱۵ سب سے اخیر اور نادر نسخہ وہ ہے جو فشی رحمت اللہ علیہ کے مالک نامی پریس نے شایع کیا ہے اس میں فرہنگ کے علاوہ متعدد نقشہ جات ہیں جو قابل دید ہیں۔

تو اس سلسلے کی وہ قدر دانی کی ہے جسکی نظیر مشکل ہے۔
 غالباً ۱۹۱۱ء میں حضور مدوحہ نے سترجہ ذیل اشعار کی
 اپنے قلم مبارک سے آئیں پینٹنگ کی بحفایت اعلیٰ درجہ کی تصویر
 بنائی جو حضور مدوحہ کے حسن مصوری کا بھترین نمونہ ہے۔

۱۵ حضور مدوحہ کی قدر شناسی اسی پر ختم نہیں ہوئی بلکہ ۱۹۱۶ء میں
 جب خواجہ سیاح حسین خاں میموریل اسکول کی امداد کے لئے
 بھوپال آئے اور ہرمانس سے ملاقات کی تو بہت سی باتیں
 ہوئیں سلسلہ گفتگو کو اس قدر طوالت ہوئی کہ خواجہ صاحب بخیاں
 تقصیرِ اصل مقصد عرض نہ کر سکے۔ جب رخصت کی اجازت
 چاہی تو حضور مدوحہ نے ارشاد فرمایا کہ:-

۱۶ خواجہ صاحب جس مقصد سے کہ آپ نے بھوپال کا سفر
 کیا ہے ابھی اس پر تو گفتگو ہی نہیں ہوئی میں مولانا حالی
 مرحوم کی یادگار قائم کرنا ہر مسلمان کا فرض سمجھتی ہوں۔ میں نے
 ان کی قومی نظموں کا مطالعہ کیا ہے اور مجھے معلوم ہے
 کہ قومی اصلاح میں ان نظموں کا کیا اثر ہے۔ میں ضرور
 اس میموریل میں مدد دوں گی۔

(بقیہ حاشیہ پر صفحہ آئندہ)

۴۲
 ملے کوئی ٹیلہ اگر ایسا اونچا کہ آتی ہو وہاں سے نظر ساری دنیا
 چڑھے اس پہ پھر اک خرومند دنا کہ قدرت کے دنگل کا دیکھے تماشا

تو قوموں میں فرق اس قدر پایا گیا وہ

کہ عالم کو زیر و زبر پاسے لگا وہ

وہ دیکھے گا ہر سو ہزاروں چہرے ان بہت تازہ تر صورت باغ رضوان

بہت اُن سے کمتر پر سر سبز و خندان بھیت خشک اور بے طراوت مگر ہل

نہیں لائے گو برگ و بار ان کے پوئے

نظر آتے ہیں ہوتھا اُن کے پوئے

پھر اک باغ دیکھے گا اُبڑا سر اسر جہان خاک اڑتی ہے ہر سو برابر

نہیں تازگی کا کھین نام جس پر ہری ٹھنیاں جھیر لگائیں جسکی جل کر

نہیں بھول بھیل جس میں آنے کے قابل

ہوئے روکھ جس سے جلانے کے قابل

جہان ترہر کا کام کرتا ہے باران جہان آگے دیتا ہے روا بر نیان

تر و در جو اور ہوتا ہے دیران نہیں اس جس کو خزان اور بھاران

یہ آواز بہم وہاں آرہی ہے

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۱ - چنانچہ شام ہی کو بارہ سو سو پچیس سال کی اعداد کا

حکم خواجہ صاحب کے ہاتھوں میں تھا۔

۱۲۵
کہ اسلام کا باغ ویران یہی ہے

اس کے بعد مولانا اگست ۱۸۸۷ء میں علیگڑھ تشریف لے گئے
متحدہ دفعہ مدرسۃ العلوم کو دیکھا اُس وقت اُس کی ابتدائی
حالت تھی اس کے قیام کو چھ سال ہی گزرے تھے، عمارتوں
کی کچھ کچھ تعمیر شروع تھی۔ تحفون نے بورڈ روم کے رہنے سہنے،
اُن کی طرز معاشرت، تعلیم اور اخلاق و تربیت پر نظر کی اور ایک
خاص اثر لے کر وہاں سے واپس آئے وہی پھنچکر اسی اثر میں
مولانا نے یہ ترکیب بند نظم کیا۔

ترکیب بند

ایک بڑھیا نے سر رہ لا کے روشن کر دیا	جھٹ پٹے سے وقت گھر سے ایک ٹی کلویا
راہ سے آسان گزر جائے ہر ایک جھوٹا	تاکہ رہ گیا اور پرہی کہیں ٹھوکر نہ کھائے
روشنی محلوں کے اند ہی ہے جن کی سدا	یہ دیباہ تو ان جہاڑوں اور اس کی سدا
ہے اندھیرا لپ درو دیوار پر چایا ہوا	گر نکل کر ایک ذرا محلوں سے باہر دیکھو

سچ رہو دریا میں وہ حاجت روا بیتا رہیں

۱۷ افسوس ہے کہ یہ ترکیب بند مولانا کے مجموعہ نظم کی جدید اشاعتوں میں نہیں ہے

روشنی سے جن کی ملاحت کے پیرے پاہین
ہم نے ان عالی بناؤں سے کیا اکثر سوال
شان و شوکت کی تمہاری ہوم ہوی آفاق میں دور سے آ کے تملود یکتہ ہیں پاکمال
قوم کو اس شان و شوکت سے تمہاری کیا لا دو جواب اس کا اگر کہتے ہو یا راقمال
سرنگوں ہو کر وہ سب پولین بھال ہو سکا ہم سے نہ کچھ الافعال الافعال
بانوں نے تھا بنایا اس نے گویا ہمیں

ہم کو جب دیکھیں خلف اسلاف کو رویا کریں
شوق سے اس نے بنایا مقبرہ ایک شاندار اور چوڑا اس نے ایک ایوان عالی یادگار
ایک نے دنیا کے پودے باغ میں انچونگا ایک نے چوڑے دھنسیں دم دز کے بے شمار
اک محب قوم نے اپنے مبارک ہاتھ سے قوم کی تعلیم کی بنیاد ڈالی استوار
ہو گی عالم میں کہو سر سبز یہ بچہ بی مراد یا وہ اگلوں کی اسیدین لائینگی کچھ برگ با

چشمہ سر جیون ہے جو بہتا رہے گا یہاں پری

سب تر جہاں کی چڑھ کر نہ بیان برسات کی

دور سے ایسے ہلکی سی ایک کملائی ہو ایک کشتی ڈوبتے پیرے کو لینے آئی ہے
قوم کے بیرون جوان سب ہو گئے تھے مردہ کی درو مندی خوش میں چند ایل دل کو لائی
ہاؤ گے تلخ زمین ہرگز نہ تم اس کی مشا سلطنت نے قوم کی جو یہاں مدد فرمائی
غیر قوموں نے بھی کی ہو شہر طہر دیوئی یہ بنا چلتی ہو تاک کو بھی دل سے بھائی

اؤ ہم بھی اسے عزیز و مفتخر سمجھیں اسے
اک ضروری کام اپنا کم سے کم سمجھیں اسے

یہ مبارک گھر نزولِ خیر و برکت ہے جہاں جبکی بیٹائی سے ظاہر ہیں حادثہ کے نشا
یہ نہال تارہ جس کو اک زمینِ شہرین خرم و سرسبز کرنا چاہتے ہیں باغبان
یہ مسیحاؑی علاجِ اس درد بے درمان کا لادو اٹھیرا چکے جس کو اطباء نے زمان
یہ نمونہ اس عزیز مہر کا جس نے ستم جن ہاتھوں سے سجدی قحطی کو مانا
عہدِ پیمان اے عزیزِ و تم سے کچھ لینے کو ہے

قوم کو پہرہ رکھتین بے انتہا دینے کو ہے

آ رہی ہے اس مکان کے گوشہ گوشہ صدا قوم اگر سمجھے تو ہوں میں قوم کا حاجت روا
ہے کوئی اکیس دریا میں تو ہوں اکیسین اور اصل کھیا کچھ ہے تو میں ہوں کھیا
ہاتھ آجاتا سکندر کو اگر میرا سراغ چوڑ دیتا جستجوئے چشمہ آب بقا
میرے جو حامی ہیں انکی ہیلنگی کرکٹیں ایک داتہ سے ہوں تو نئے جھجھکے بڑا ہوتا
ہے عبت اگر قوم نے بے وقت پہچانا مجھے

برکتیں ان پر جنہوں نے وقت پر جانا مجھے

اُس کے کہہ دو قوم میں ہیں جو کہ عالی خانہ یا جنہیں جاگیر و منصب پہ ناز بیکار
کیا لے بیٹھے ہو فخر منصب جاگیر کو منصب جاگیر میں سب کوئی دن بھار
تم بھین تیرے میں بڑھ کر تعلق و تہور سے تنگ ہے آج انکی شاہانِ بزمین آسمان

۱۶ چوڑھا دوا سٹے اولاد کے کوئی سپر
ورنہ دار اپنا کرے گی گردشِ روزگار
آؤ یاد ہو محمد مجھ سے اور میرا ساتھ دو

میرا سودا تقدیر اس ساتھ دو اس ساتھ ہو
میں تمہیں اپنی سے پہنچاؤنگا تا اوج کمال
میں نہاؤنگا تمہارے کام بے بگاڑ ہو
جو کرے آج میری دست و بازو سے مدد
قوم کا حامی ہوں اور اسلام کا یار ہوں
لوگ اراکفر سمجھیں مجھ کی یاد اراکفلا

میں دکھاؤنگا کہ جو دشمن تھے میرے نام کے
تھے حقیقت میں وہ دشمن قوم اور اسلام کے

ملک میں عزت رہنا میں کہاؤنگا تمہیں
قابلیت تم میں بڑھنے کی ہو دیکھو کس قدر
تب یہ سمجھو گے کہ ہم سوتے تھے کب تک بیخبر
یاد ہوگا تلووہ کو یا ہوا اپنا خطاب
سلطنت کا متہ بننا بناؤنگا تمہیں
بڑھ سکے جب قدر اتنا بڑاؤنگا تمہیں
دفعۂ ناجبِ غفلت سے جگاؤنگا تمہیں
پھر مخاطبِ خیر امت کا بناؤنگا تمہیں
مجھ کو دیکھو اگر میرے دعووں میں ہو کچھ اشتیاء

روز روشن آپ اپنی روشنی پر ہے گواہ

بارک اللہ اسے ریاضِ علمائے عینِ حیا
ہو تو ہو اب روشنی تیری دلیں کارِ دیا
ہی ہمارے بخت و دولت کی عثمانِ انصاری
چاہے سو کالی گستاخاں کی ہزار کالی سپاری

قوم سے تو بھی یونہیں جہل و تدبیر کو بٹھا کر
 جھوٹا بیگنے جہان میں جو کہ تجھ جیسے
 جھوٹا بیگنے وہی کچھ باتیاں اصالحا
 ایک باہمت جماعت جیتے تیرے ساتھ ہو

ہم سمجھتے ہیں تیرے سر پر خدا کا ہاتھ ہے
 تو سدا آباد رہے قوم کے امید گاہ
 دیکھتے ہیں غیر حیرت اور تعجب سے تجھے
 قوم نے اب بھی اگر جہان تجھ کو آہ آہ
 اپنے حامی آپ پیدا کر کہ وہ سر بلند
 اپنی پونجی سے جو آپ اپنے لئے لپٹے بنا
 خیر کی امید رکھنی جو عیش اس قوم سے
 آپ کو جس نے کیا ہوا اپنے ہاتھوں سے تباہ
 چارہ آخر کچھ بھین جالی سبز صبر و سکون
 کرو عا ایا اھک کوئی اھکے لایکھ کوٹ



مولانا کی طبیعت نوکری کے قابل نہ تھی اس لئے وہ ہمیشہ پریشان
 رہتے تھے مگر جب ۱۸۸۸ء میں نواب مرآت خان جاہ و وزیر دولت آباد
 نے ان کا وظیفہ علمی مقرر کر دیا تو وہ ملازمت سے سبکدوش ہو گئے
 اور اگرچہ خانگی تردد و آلام کا سلسلہ موجود تھا اور صحت بھی اکثر
 و بیشتر خراب رہتی تھی لیکن اب زیادہ وقت تصنیف و تالیف،
 مطالعہ اور کتب بینی میں گذرتا تھا۔

وہ اکثر آل انڈیا محمدن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاسوں میں شریک ہوتے اور اپنی پرورد نظموں سے مسلمانوں کے دلوں کو گریاتے۔

۱۹۱۷ء میں جب انھوں نے علیگڑھ کے اجلاس میں ایک ترجیح بند سنا یا جس میں متوسط درجہ کے لوگوں کی حالت کو فقرا اور اغنیاء دونوں کی حالت سے بہتر دکھایا تھا اور انھیں کے ساتھ تمام قومی امیدوں کو وابستہ کیا تھا تو اجلاس پر ایک عجیب عالم طاری ہو گیا تھا کیونکہ شرکاء اجلاس میں ہی طبقہ بہت زیادہ تھا جس کو مولانا نے خطاب کیا تھا۔

نظم کے ختم ہونے پر سرسید نے بے اختیار اجلاس کو مخاطب کر کے کہا کہ:-

”اے دوستو! آج یہ نظم جو مولانا حالی نے پڑھی ایک عجیب مہم ہے کہ شاید ایسی نظم فارسی اردو اور عربی میں بھی کسی شاعر نے نہیں لکھی۔ یہ نظم نصیحت دیتی ہے ان لوگوں کو جن کے دل اس دنیا کی دولت اور ترقی میں پھنسے رہتے ہیں اور متوسط درجہ کے لوگوں کو ایک نتیجہ بتاتی ہے کہ وہ باتیں جو ان کو نصیب ہوئیں اعلیٰ سے اعلیٰ دولت مندوں کو بھی نصیب نہیں شاعری جو ہر دہائی سے ہندوستان میں جاری ہے وہ سب لوگ یقین کرینگے

کہ ان کے مضامین کے بیان کرنے سے کوئی خوشی شاید کاٹون کو ہوتی ہو مگر دل میں اثر کرنے والی نہیں ہوتی۔ لیکن جو طریقہ ہمارے محذور نے اختیار کیا ہے وہ ایسا مشکل ہے کہ اس کا اختیار کرنا ہر ایک کا کام نہیں ہے۔ جذبات انسانی کو سہل الفاظ میں بیان کرنا اس طرح کہ لوگوں کے کان میں پڑتے ہی دل میں کام کر جائے مولانا حالی ہی کا کام ہے ہم کو خدا کا شکر کرنا چاہیئے اور فخر کرنا چاہیئے کہ ہماری قوم میں ایک ایسا شخص پیدا ہوا۔ آئندہ زمانہ میں جو کہا جاوے گا کہ فخر قوم، فخر شعراء، فخر علماء، اور زندہ کرنے والا اور راہ بتانے والا اندرونی جذبات کا اور ان سے نجات دینے والا قوم کا کون ہے تو کہا جاوے گا کہ حالی،

وہ اسی سال سیرید کے ہمراہ ڈیمپوٹیشن میں حیدرآباد بھی گئے تھے جہاں نواب وقار الامرا کی صدارت میں ایک عظیم الشان جلسہ بشیر باغ میں منعقد ہوا تھا جس میں مولانا اور مولانا شبلی نے اپنی نظمیں جو اس موقع کے لئے لکھی تھیں سنائیں۔ مولانا حالی نے ایک قصیدہ پڑھا تھا جس میں نواب سرآسمان جاہ اور دیگر امرا کی عنایتوں کا شکر یہ اور اعلیٰ حضرت کی مدح اور ایڈریس قبول کرنے کے تذکرہ کے بعد اس سفر کا مدعا اور حیدرآباد

۲۰
سے قوی امیدوں کی وابستگی کا اظہار تھا تو اس وقت ایک
عجیب سا من بندہ گیا تھا۔

نواب وقار الامرا پر خاص اثر ہوا اور انھوں نے ”معل فلک“
پر مولانا حالی اور مولانا شبلی کو مدعو کر کے پھر دو بارہ یہ نظمیں
سنیں اور اس میں شک نہیں کہ ان نظموں نے وہاں افراد
کو بہت متاثر کیا۔

غرض ان کی طبیعت کے سوز و گداز اور ان کے ہمدردانہ
جذبات اور ان کے فضل و کمال نے قوم کے تمدن و معاشرت
استقلال و عادات اور لٹریچر پر ایک نہایت اور دیر پا اثر ڈالا
اور جب تک ان میں طاقت رہی مختلف صورتوں میں اپنے
شاعرانہ کمال کو ان ہی مقاصد پر صرف کرتے رہے لیکن اسی
کے ساتھ بذات خاص مالی امدادوں کے لیے بھی کوشش کرتے
رہتے تھے چنانچہ جب ۱۸۹۹ء میں سرسید لاہور گئے ہیں
تو مولانا نے بڑی سرگرمی سے بانی پت اور کربلا میں چند جمع
کیا اور واپسی میں سرسید کو بانی پت میں ٹھہرا کر تین ہزار سے
زائد رقم پیش کی۔

سرسید سمویل فنڈ اور یونیورسٹی کی تحریک کو بھی انھوں نے

اپنی نظموں اور کوٹ شون سے تقویت دی۔

لاہور کے جلسہ کی تقریر جو یونیورسٹی کے رزلوشن کی تحریک کے متعلق ہے یونیورسٹی کے بنیادی لٹریچر میں ایک خاص اہمیت رکھتی ہے۔

وہ نواب محسن الملک کی خوبیوں کے بڑے قدر شناس تھے اور سرسید کے بعد جو شکلات روتا ہو گئی تھیں اُن کے دور کرنے میں باوجود نا سازی مزاج برابر کام کرتے رہتے تھے۔ کانفرنسوں اور جلسوں میں شریک ہو کر قوم میں جوش پیدا کرتے تھے۔ مولانا کو ششہرہ تعلیم کی ملازمت کی وجہ سے تعلیمی معاملات میں ہی کافی تجربہ تھا اور پھر تعلیمی مجالس کی شرکت اور اُن میں تبادلہ خیالات نے اُن کو زبردست ماہر تعلیم بنا دیا تھا اس لحاظ سے ۱۹۰۸ء میں اجلاس کانفرنس منعقدہ کراچی کے صدر منتخب ہوئے اور آکھون نے اس اجلاس میں ایک ہنایت شاندار خطبہ صدارت پیش کیا جس کا ابتدائی حصہ ہا میں نواب محسن الملک کا تذکرہ تھا بہت درون کا تھا جس کو پڑھتے ہوئے مولانا خود آبدیدہ ہو گئے اور ۳۰ منٹ سے زیادہ نہ پڑھ سکے اور مولوی وحید الدین صاحب سکیم نے پورا کیا اسکے

بعد مولانا نے سندھ کا وہ تعلق جو اسلام اور علوم اسلام کے ساتھ رہا ہے اسکی علمی رفعت اور بکھر موجودہ نہ بون و خرابا حالت پر تبصرہ کرنے کے بعد اس کی تعلیمی و تمدنی اصلاحات کی تجاویز لیا کین پھر انہوں نے یہ دکھا کر کہ عالم اسلامی میں تعلیمی تحریک کس طرح شروع ہے روسی مسلمانوں کی تسلیمی جدوجہد اور تعلیمی فیاضیوں کا تذکرہ کیا اور دکھایا کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں اس میں گورنمنٹ روس کی اعانت شامل نہیں ہے اور ہندوستان میں پست قوموں کی اعانت گورنمنٹ فیاضی کے ساتھ کرتی ہے مسلمانوں کو ان کی کوششوں سے بہت لینا چاہیے پھر انھوں نے صنعت و حرفت پر بحث کی اور فرمایا کہ :-

صاحبو! صنعت و حرفت کی ضرورت ہندوستان میں عام طور پر تسلیم کی جاتی ہے۔ جب سے سدیشی تحریک شروع ہوئی ہے۔ ہمارے ہموطن اوس کی طرف اور بھی جلد جلد قارم بڑھا رہے ہیں۔ گورنمنٹ نے بھی تسلیم کر لیا ہے کہ اس ملک کی مالی مشکلات۔ جن میں وہ اکثر مبتلا ہوتا رہتا ہے ان سے اس کا نجات پانا محض صنعت و حرفت کی ترقی پر منحصر ہے۔ ممالک متحدہ میں اسی مقصد کے لئے انڈسٹریل کانفرنس قائم کی گئی ہے اور صوبوں میں بھی اس طرف توجہ ہوتی جاتی

ہے۔ اگرچہ مسلمان بھی اس ضرورت سے انکار نہیں کرتے لیکن عملی طور پر وہ اب تک اُس سے بالکل الگ رہتے ہیں اور نہایت اندیشہ ہے کہ جس طرح وہ ابتدائیں انگریزی تعلیم سے نفرت کرنے کے سبب اپنے تمام جمہور وطن قوموں سے پیچھے رہ گئے اور اب کسی طرح اُن کی برابری نہیں کر سکتے اسی طرح صنعت و حرمت سے بھی اس وقت ان کی غفلت کا وہی انجام نہ ہو۔ بین صنعت و حرمت کی تعلیم کے متعلق آپ صاحبوں کے سامنے کوئی نئی بات نہیں کہتا بلکہ جو کچھ پہلے کہا جا چکا ہے اُسی کو دہراتا ہوں اور قوم کے لیڈروں کو یاد دلانا ہوں کہ تعلیم یافتہ نوجوانوں کو صنعت و حرمت کی طرف متوجہ کریں۔ بین سمجھتا ہوں کہ اگر ہر سال ہر درجہ کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو صنعت و حرمت کی تعلیم کی غرض سے انکی حیثیت کے موافق معقول وظیفہ دئے جایا کریں تو امید ہے کہ چند سال میں ایسے کثیر التعداد نوجوان پیدا ہو جائیں گے جو اپنے ہم چشموں کو آزاد پیشہ برہانہ ڈالنے کی جرات دلا سکیں گے اور اگر قوم کے دولت مندوں کو خدا ایسی توفیق دے کہ بی اے پاس نوجوانوں کو وقتاً فوقتاً صنعت و حرمت کی تعلیم کے لئے معقول وظیفہ دے کر یورپ یا جاپان بھیجتے رہیں تو امید ہے کہ تھوڑے عرصہ میں ہماری قوم کے دن بھر جائیں گے۔

اس کے بعد صنعتی و طائفہ قائم کرنے اور زراعت کے جدید طریقوں کی تعلیم پر توجہ دلائی اور آخر میں فرمایا۔

۱۸۵۷ء میں مسلمانوں کی قومی ترقی کے لئے محض یونیورسٹی کی موجودہ تعلیم کافی نہیں بلکہ ضرور ہے کہ وہ تعلیم کے ہر ایک شعبے میں دستگاہ حاصل کریں اور اس دور میں جس میں کہ ان کے ہم وطن ان سے بھت دور آگے نکل گئے ہیں۔ جہاں تک ممکن ہو شریک ہوں۔ وہ زمانہ بہت قریب ہے کہ ان کو نہ صرف اپنی عزت و توقیر سے بلکہ اپنے بقا اور اپنی ہستی سے بھی ہمیشہ کے لئے دست بردار ہونا پڑے گا

جو اپنے ضعف کا کچھ کرتی تھیں ہمارے! قومیں وہ چند روز دنیا میں جہاں ہیں گھر بیاں اور گھر چھپ رہی ہیں ان کو لگیکھ جائے دریا میں پھیلیاں جو کہ زور و ناتوان ہیں!!
سنبھلو ورنہ رہنمایان اس طرح پڑے گا
بھیل اور گھڑی جیسے گناہ و بے نشان ہیں

(۴)

مولانا اس فضل و کمال کے ساتھ اخلاق و عادات میں بھی فرد فرید تھے اور ان کے وسیع اخلاق میں قرون اولیٰ کے مسلمانوں کا پرتو تھا قرآن و حدیث کے مطابق آئے ان کی فطرت صحیحہ کو جلا دیدی تھی۔

ان کو کچھ کم چالیس سال محض کلج کے ساتھ تعلق رہا اور اس عرصہ میں بہت سے دشوار گزار مراحل پیش آئے بہت انقلابات ہوئے آپس کے تنازعات نے اس کی بنیادوں تک کو ہلادیا۔ لیکن مولانا نے ایک ستولی ڈسٹری کی حیثیت سے بھاری دیا ننداری اور صداقت سے اپنے فرائض تو لیتا ادا کئے۔

اُن کے دل میں سرسید کا انتہائی احترام تھا، وہ سرسید کے تمام کاموں کو عزت اور محبت کی نظروں سے دیکھا کرتے تھے اور اپنے خانگی خطوط میں اُن کی بعض صفات کو نمونے اور مثال کے طور پر عزیزوں اور دوستوں کو لکھتے تھے۔

لیکن سرسید کی اس عظمت و محبت کے مقابلہ میں اُن کے

دل میں اُس کام کی وقعت و اہمیت بھی بہت زیادہ تھی جو سرسید نے کیا تھا اور اسی بنا پر ایک ایسا وقت بھی آیا کہ حالی کے درست و ظلم نے شائع میں نواب محسن الملک اور نواب قار الملک کے ساتھ شریک ہو کر ایک سیارہ داشت پر دستخط کئے جو ٹریڈیوں کے نام لکھی گئی تھی اور جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ کلج کی خبر لین اور اُس کو یورپین اشاف کے ہاتھوں میں پہلے جانے سے روک لیں جس کا مطلب یہی ہو سکتا تھا کہ سرسید کو کلج سے بے دخل یا معزول

کر دیا جاوے۔

۱۸۸۹ء میں جب سید نے سید محمود کی جانشینی کا مسئلہ پیش کیا ہے تو ان حالات کی بنا پر جو اُس وقت تھے مولانا نے سید کی حمایت و تائید کی تھی لیکن ۱۸۹۰ء میں جبکہ سید محمود کو کلچ سے سبکدوش کرنے میں کلچ کی بھرتی معلوم ہوئی تو مولانا نے ان کو سبکدوش کرانے میں پورا حصہ لیا۔

آنریبل مسٹر مارین سے اُن کے مخفایت گہرے تعلقات تھے اور ان تعلقات کا اندازہ اُس نظم سے ہوتا ہے۔ جو انھوں نے مسٹر مارین کے اداعی جلسہ میں پڑھی تھی لیکن جب انھوں نے اپنا جانشین مسٹر کارنا کو مقرر کرانا چاہا ہے اور اس پر زور دیا ہے اور نواب وقار الملک نے سخت اختلاف کیا ہے تو مولانا نے نواب وقار الملک کا ہی ساتھ دیا اور نہ صرف ساتھ دیا بلکہ اور ٹرسٹیوں کو بھی ہم راے بنایا۔

اگرچہ مولانا ٹرسٹی شپ کے فرائض پورے طور پر انجام دیتے تھے اور جو کچھ اُن کے امکان میں تھا کلچ کی بھبودی کے لئے کرتے رہتے تھے۔ لیکن وہ ٹرسٹیوں کی عام بے توجہی اور کمزوری کو محسوس کرتے تھے اور ۱۸۹۰ء کی شورش طلباء کے تحقیقاتی کمیشن کے

۲۷
 پریسٹنٹ کو اٹھون نے آزادی کے ساتھ مشورہ دیا تھا کہ نکلے
 اور نالایق ٹرسٹیوں کی بھرتی جو سید کے زمانہ میں ہوئی تھی
 اور ابھی تک وہی اصول چلا آ رہا ہے اس کو ختم ہونا چاہیے
 اور ایسی تدابیر کرنی چاہئیں کہ جن سے موجودہ ٹرسٹیوں
 کی عقلیت اور بے پروائی کا انسداد ہو اور آئندہ کسی عہدہ اور محکم
 اصول سے ان کا انتخاب عمل میں آیا کرے۔

اسی طرح نواب وقار الملک اور مسٹر آرچیولڈ کے جھگڑے میں
 جو سکرٹری اور پرنسپل کے اختیارات کے متعلق تھا اور جن میں
 ہزار ہا نفٹنٹ گورنر نے بعض مشورے ایسے دئے تھے جن سے
 اتفاق کرنے میں قومی وقار کو صدمہ پہنچتا تھا اور اس کے خلاف
 ٹرسٹیوں نے رزولوشن تیار کئے تھے تو مولانا کو اندیشہ لاحق
 ہو گیا تھا کہ زمیندار تعلقہ دار عہدہ داران سرکاری اور ان کے
 علاوہ بعض دیگر اصحاب ہزار ہا کی ناراضگی کے وہی خیال سے
 اختلاف کریں گے اور مخالفین کے غلبہ رائے کی صورت میں
 آنریری سکرٹری استعفیٰ دیدیں گے دوسری طرف پرنسپل کے
 استعفیٰ ہو جانے اور اس استعفیٰ سے حکام انگریزی کے
 دلون پر حزب اثر پڑنے کا بھی اندیشہ تھا مولانا نے ان اندیشوں

۳۸
 کو خواجہ سجاد حسین صاحب کے نام ایک خط میں لکھ کر اپنی
 رائے اس طرح ظاہر کی کہ:-

”لیکن پہلا اندیشہ دو سکا اندیشہ ہے میرے نزدیک زیادہ
 سخت ہے کیونکہ ہزاروں کے وہ مشورے مان لئے گئے جن کے
 قبول کرنے سے عذر کیا گیا ہے تو سکرٹری بلکہ تمام ٹرینیوں
 کا عدم وجود برابر ہو جائیگا اور محمدن کالج کمپنزلہ گورنمنٹ کالج
 کے ہو جائے گا“

غرض مولانا تھے اس فرض کو ہر موقع پر کامل خلوص اور دیانت
 سے انجام دینے میں کسی دوست یا عزیز حتیٰ کہ خود سر سید رحم
 کی بھی پروا نہیں کی۔

”اُن کا دل درد سے بھرا ہوا تھا جو نہ صرف انعموں میں نمایاں
 تھا بلکہ اُن کی روزمرہ کی زندگی اور اُن کے تمام تعلقات میں
 ظہور پذیر تھا۔ وہ اپنے خائلی خطوط میں اپنے بیٹوں اور عزیزوں
 کو بھی لوگوں کے ساتھ بھلائی اور ہمدردی کرنے کی نصیحت
 کیا کرتے تھے۔ ایک موقع پر کسی عزیز کی سفارش کرتے ہوئے
 لکھتے ہیں:-

”میں تو فرائض کے بعد کوئی عبادت اور کوئی بھلائی اس کے

برا برہمنین سمجھتا کہ اولاً اپنے عزیزوں اور دوستوں کے ساتھ
اور پھر تمام اپنا وجود جس کے ساتھ جہان تک ممکن ہو سکا
اور بھلائی کی جاسکے گا۔

اسی طرح ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں کہ ”ایک ہمایہ
کی تکلیف دوسرے ہمایہ کے لئے سولہاں روح ہوتی ہے۔“

وہ طلباء کی امداد بھی حتیٰ الوسع اپنے پاس سے کرتے رہتے
تھے اور جو عزیز یا دوست اس قابل ہوتے کہ ان سے مدد ملو
جائے تو ان کو بھی سقارش کے خطوط لکھتے۔ وہ اپنے اعزاء کی
دنیادی ترقیوں سے ہی خوش ہوتے والے تھے۔ بلکہ ان کی
اخلاقی ترقی کے بھی آرزو مند تھے اور یہی وجہ تھی کہ روزمرہ کے
خطوط میں بھی وہ عزیزوں کو مختلف پیرایوں میں دلپذیر نصائح
کرتے رہتے تھے۔

ان کے بیٹے خواجہ تصدق حسین صاحب مرحوم ان کی سفارش
اور کوشش سے اکسٹرا اسٹنٹ کمشنری پر مامور ہوتے ہیں
اور وہ اس کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ مولانا اس کے جواب
میں لکھتے ہیں کہ

”جو باتیں تم نے میری نسبت لکھی ہیں یہ محض ہمتااری و تمنا ہی

اور کسی قدر مختاری نادانی کی دلیل ہیں
 اگر بفرض محال میری کوشش کو مختاری
 کامیابی میں کچھ دخل ہوا ہی تو اس کو تقسیماً
 ایسا ہی سمجھنا چاہیئے جیسا کہ ایک باپ کی کوشش کو
 بیٹے کی کامیابی میں ہوتا ہے اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں
 ہے کیونکہ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا رہا ہے اور ایسا ہی ہوتا رہے گا
 تعجب کی وہ باتیں ہیں جو آج کل لوگ دنیا میں کر رہے ہیں
 عزیزوں کے بچوں کو تعلیم دلواتے ہیں اپنی بساط سے زیادہ ان کی
 امداد کرتے ہیں تمام قوم کے لئے ویسی ہی کوششیں کرتے ہیں
 جیسے کسی خاندان کا سرپرست اپنے خاندان کے لئے کرتا ہے اپنی جان
 اور مال اور وقت اور دل و دماغ کو قوم کے لئے وقف کر رکھا ہے قوم کی طرف سے
 اُن پر گالیاں پڑتی ہیں مگر وہ قوم کا خیال نہیں چھوڑتے اور رات دن اُسی میں
 بین لگے ہوئے ہیں یہ لوگ بین جن کا ہم کو اور قوم کو اور تمام قوم کو دل و جان
 سے شکر ادا کرنا چاہیئے اور انہیں کا صدقہ ہے کہ ہماری قوم میں
 کسی قدر آپس کی ہمدردیوں کا خیال پیدا ہو گیا ہے۔

وہ فزخ حوصلہ اور قدر شناس فقیر مہنتین کی حوصلہ افزائی کرتے
 ان کی کتابوں کو خرید کر دل چسپی سے پڑھتے اور بعض اوقات شہدائی

خرید کر لائبریری میں بھیج دیتے تھے۔ مولوی عبدالرزاق صاحب سے
برسبیل تذکرہ ایک تہہ فرماتے تھے کہ جس کتاب کی قیمت ادا کی جاتی
ہے اس کے مطالعہ میں بھی زیادہ دل چسپی ہوتی ہے۔ نوجوانوں کو
عملی کاموں کا شوق دلانے مولوی عبدالرحیم صاحب سہ ماہیہ سیدل کے ایک
خط میں لکھتے ہیں کہ:-

عزیزی خواجہ عبدالحمید خان صاحب کو بہت بہت دعا پہنچے۔ آئندہ
کہ اب ان کے بچے سب بچریت ہوں گے معلوم نہیں کہ اُفقوں نے
میرے عرض کرنے پر کوئی مشغلہ اختیار کیا یا نہیں؟ ان کو خدا تعالیٰ
نے ایسی بیاقت دی ہو کہ ملک اور قوم کو بہت کچھ فائدہ پہنچا سکتے
ہیں اور چونکہ عنایت الہی سے تلاش معاش کی ضرورت نہیں
ہے اس لئے ان کے علمی مشغلوں میں کوئی چیز مزاحم نہیں ہو سکتی
میرے نزدیک ہر کتابوں اور اخباروں کا مطالعہ کرنا اور
کوئی علمی کام نہ کرنا اپنے علم کی ناقدر دانی اور اپنی قیمتی زندگی کو راکھ
کھوٹا ہوا اس موقع پر میں اپنی ذیل کی رباعی لکھتا ہوں اور چاہتا ہوں
کہ عزیز موصوف بھی اس کو پڑھیں اور اگر وہ درحقیقت سودیشی
تحریر کو دل سے پسند کرتے ہیں تو اس رباعی پر عمل کریں ۵
یارو نہیں وقت عیش آرام کا یہ موقع ہے اخیرت کرانجام کا یہ

بس حب وطن کا جب چکے نام بہت اب کام کر کہ وقت ہے کام کا یہ
 انہوں نے جو خطوط مولوی عبد الحق صاحب ابی اسے کو لکھے ہیں
 ان کے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ قابل فوج والوں کو سطح
 ابھارتے تھے اور ان کے کاموں کی کیسی قدر کرتے تھے اسی
 سلسلہ میں ان سے ایک کتاب ”خاتون ہند“ پر ریویو کرنے
 کی فرمائش کرتے ہیں اور اس کا مقصد یہ بتاتے ہیں کہ

”ریویو لکھوانے سے مقصد یہ ہے کہ مولف کتاب جو میراجم ولسنج
 اس کو شرمایا جائے کہ باوجود میراجم ہونے اور دعوے بے تعصبی
 کے ایک ایسی کتاب میں جو عورتوں کے لیے لکھی گئی ہو اور جس کا
 مقصد ہندوستان کی عورتوں کے خیالات کی اصلاح ہو ایسے
 متعصبانہ خیالات ظاہر کرنے اور وہ بھی محض بے اصل اور تاریخ
 کے خلاف ایک برہمن سماج کے مہر سے نہایت بے جا اور قابل افروغ
 اور ان کو اس بنا پر برا انتخاب کرتے ہیں۔“

دو جگہ آپ نے عالمگیر کی لائف کو ایک مصنف کی نظر سے مطالعہ

۵۔ یہ کتاب ایک ہندو مصنف نے جو برہمن سماج کا مہر تھا تالیف کی تھی جسکی نسبت
 مولانا کو پھلے چس تن تھا کہ وہ غیر متعصب ہے لیکن اس کتاب کو حسین اس نے
 عالمگیر کی نسبت انتہائی تعصب کام لیا تھا دیکھئے کہ یہاں کلمہ حسن ظن جاتا رہا۔

کیا ہے اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ آپ بہت آسانی سے سو گئے مذکور
 کی قلمی کھول سکیں گے مگر یو یو کی طرز بیان بہت شایستہ اور الفاظ
 نہایت سنجیدہ ہونے چاہئیں جن سے برہم سراج کے تمام ممبر متاثر اور
 شرمندہ ہوں۔ یہ سراج برخلاف آریہ سماج کے نہایت آزاد اور صلح
 پسند ہے اس لئے مجھے امید ہے کہ آپ کے یو یو کا ان لوگوں پر
 عمدہ اثر ہوگا۔ یو یو میں اس بات پر زیادہ زور دینا چاہیے کہ جو لوگ
 ہندو مسلمانوں میں تفرقہ اور بھوٹ ڈالنے والی کتابیں لکھتے ہیں
 وہ ہندوستان کے سخت دشمن ہیں خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان
 برہمن ہوں یا آریا۔

اور جب یو یو لکھ کر د لگداز میں شائع کرتے ہیں تو مولانا کس خوشی
 کے ساتھ اترتے ہیں کہ۔
 ”د لگداز میں خاتونان ہند پر آپ کا یو یو دیکھ کر بہت ہی جی خوش
 ہوا اور اسی خوشی میں د لگداز کی خدیہ اری کی درخواست آج بھیج دی
 ہے یہ بھی لکھ بھیجا ہے کہ ایک کاپی اس نمبر کی مصنفہ خاتونان ہند
 کے نام لاہور ضرور بھیج دیں اس کی قیمت میں خود دے گا۔“
 ایک اور خط میں ان کی ایک کتاب زیر ثالیف کی نسبت لکھتے ہیں کہ
 ”اسلامی حکومت میں ہندو مسلمانوں کے تعلقات پر جو کتاب آپ لکھ

۳۴
 رہے ہیں خدا کرے وہ میری زندگی میں پوری ہو جائے۔ مجھے اس کے
 دیکھنے کا نہایت اشتیاق ہے۔“

مولانا کی صحت تو عرصہ سے خراب ہو چکی تھی، ۱۹۱۰ء میں
 بصارت پر بھی اثر پڑ گیا تھا اور دماغ بھی کمزور ہو گیا تھا لیکن کوئی
 نہ کوئی علمی کام ضرور کرتے رہتے تھے ۱۹۱۲ء میں بہت ضعیف ہو گئے
 تھے اور اب بغیر کسی مددگار کے کام کرنا مشکل تھا ایک عزیز کو نہایت
 اصرار کے ساتھ لکھا کہ وہ آجائیں تو ان کی امداد سے کچھ کام کریں
 اس خط میں یہ حسرت انگیز فقرہ بھی تھا کہ، ”اب چل چلاؤ گے
 دن قریب ہیں ایک ایک گھڑی نہایت قیمتی ہے۔“
 ان کا مطالعہ اخیر وقت تک جاری رہا اور جب نظر کمزور
 ہو گئی تو اخبارات اور کتابیں پڑھنا کرنا کرتے تھے۔

علی گڑھ سے ان کو ایک خاص اُٹس تھا اور اس زمانہ میں
 بعض اسباب سے ان کا خیال مہو گیا تھا کہ وہ بہن مستقل قیام کریں
 اور اس ارادہ کی ایک دوست کو اطلاع بھی دی تھی۔

۱۵ افسوس کہ مولوی عبدالحق صاحب کی مصروفیتوں نے اس اشتیاق کو
 پورا نہیں ہونے دیا اور شاید بھیت سے مشتاق اسی اشتیاق کو
 قبر میں ساتھ لے جائیں۔

۵۴
 ۲۲ میں بھی مدت سے ارادہ کر رہا ہوں کہ علیگڑھ میں بقیۂ زندگی بسر کروں اگرچہ میں سوسائٹی میں رہنے کے قابل نہیں رہا اور تنگی اور تنہائی کو زیادہ پسند کرتا ہوں اور کسی مفید کام کرنے کی بھی اب قابلیت نہیں رہی لیکن اس خطہ سے بالطریقہ نسبتاً سید ہاشمی صاحب فریہ آبادی نے جن کو مولانا کے ساتھ بہت گھرا اور قریبی تعلق رہا ہے اپنے ایک مضمون میں مولانا کے احسان کے متعلق لکھا ہے کہ

مولوی حالی مرحوم کی زندگی شرافت و صداقت، حلم و انکسار، صبر و سادگی کا قابلِ دید نمونہ تھی۔ اُن کے اخلاق شائستہ کا پاس بیٹھنے والوں پر برہنہ تو بڑھتا تھا۔ بزرگوں نے لکھا ہے اور میں نے ان کی صحبت میں آزمایا۔ کہ نیکون کے محض حضور میں بڑے سے بڑے دل صلاح و نکوئی قبول کرتے ہیں۔ مدتِ العمر کے ساتھیوں کا بیان ہے کہ مولوی صاحب مرحوم نے کبھی اپنی زبان کو غیبت و بدگوئی سے آلودہ نہیں کیا۔ اور مجھے یہ سبق پھی مرتبہ اُن کی دلچسپ مجلس میں حاصل ہوا کہ اتنے وسیع تعلقات اور واقفیت کے باوجود بھی آدمی چاہے تو اپنی ہمہ رنگ و ہر گزیر گفتگو کو لوگوں کی سچو بے جا اور مذمت ذات سے خالی

۳۴
 رکھ سکتا ہے، اگر مرحوم کے فضل و شرف کی اس سے بھی زیادہ نمایان
 دلیل یہ وصف تھا کہ وہ جس قدر بہرہ و بامہر تھے اسی قدر فراخ
 حوصلہ اور قدر شناس تھے۔ مسلمانوں کی بگڑی ہوئی قوم میں
 ایسے افراد کم ملین گے جو اپنی ذہانت اور وسعت نظر سے
 نکتہ چینی کی بجائے قدر دانی اور ہمت افزائی کا کام لیں۔
 عیب جوئی اور تنگ دلی ہمارے اخلاق کی پستی اور قومی
 انحطاط کا نتیجہ اور آئندہ ترقی کے حق میں بہت بڑی رکاوٹ
 ہے اور اسی لئے شاید ہمیں کام کرنے والوں سے بھی زیادہ
 کام کی قدر جاننے والوں کی ضرورت ہے۔

مولوی حالی مرحوم کی معاشرت بالکل سادہ اور طالب علمانہ
 تھی ان کے مشاغل خیالات گفتگو بالکل پاک صاف اور نہایت
 معذبہ ہوئی تھی اور کبھی کوئی کرکے بات یا کلمہ ہزل آن کی
 زبان بر نہ آتا تھا،

مولانا کی اخیر حالت کا اندازہ اور ان کی مہمان نوازی وغیرہ کی
 کیفیت مولوی عبدالرزاق صاحب کے اس بیان سے معلوم
 ہوگی کہ
 ۹۱۲ء میں میری اور خواجہ صاحب کی اخیر ملاقات ہوئی میں خواجہ صاحب

کابینہ دن جہان رہا انتہا درجہ کے جہان نواز تھے دونوں وقت
 دسترخوان پر فضلی میوے اور پانی پت کی مشہور دکان کی بالائی
 ہوتی تھی۔ اس زمانہ میں خاموش ہو گئے تھے۔ باتیں بہت
 کم کرتے تھے۔ میں نے پوچھا اب شاعری کا کیا حال ہے تو
 ہنس کر فرمایا ع نہ رہی چیز وہ مضمون سمجھانے والی، پھر فرمایا
 حافظہ کا یہ حال ہے کہ بعض اوقات لغات کے معنی سوچا کرتا ہوں
 اور یاد نہیں آتے ہاں اگر اچھا مضمون ہا تھا آگیا تو اسکو باعی
 میں ادا کر دیتا ہوں۔ ضعف بڑھ گیا تھا بلا ضرورت بالاحاقہ سے
 نیچے نہیں اترتے تھے۔

۱۹۱۳ء میں خواجہ صاحب سے جو مراسلت ہوئی اس کے مطالعہ
 سے کبھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ زمانہ انحطاط کا تھا۔

۱۵ فروری ۱۹۱۳ء کے ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں کہ
 یہ نظام الملک طوسی جیسی عالی درجہ تصنیف پر ریویو لکھنے
 کے قابل اب میں نہیں رہا قطع نظر اس کے کہ قوائے جہانی
 روز بروز مضطرب ہوتے چلے جاتے ہیں دماغ بھی معطل
 بلکہ مختل ہو گیا ہے۔ خطوں کا جو اب مستثنیٰ حالتوں کے سوا
 ہمیشہ دوسروں سے لکھواتا ہوں جو کچھ لکھا پڑھا تھا سب

فراموش ہو گیا ہے۔ میری موجودہ حالت پر میرا غالب مرحوم
کا یہ شعر صادق آتا ہے۔

دیگر از خویشم بنود، تکلف بر ط
این قدر دامنم کہ غالب نام یارے دامنم
بجائے غالب کے آپ کو حالی پڑھنا چاہیئے،

غرض جس شخص کو جس قدر مولانا سے زیادہ تعلق رہا ہے وہ ہی
اُن کی خوبیوں کا زیادہ معترف نظر آتا ہے بعض ایسے قابل افراد
بھی ہیں جن کی نظر دلون کے عیوب کی تہ تک پہنچ جاتی ہے اور
ایک ذرا اسی معمولی بات میں بھی برائی کا بہت بڑا پھلو نظر آتا ہے
مگر مولانا کے وسعت اخلاق اور شرافت نفس کا بغیر کسی نکتہ چینی
کے وہ بھی اعتراف کرتے ہیں

اللہ اعلم عالم اسلام پر جن مصائب کا بھاڑ ٹوٹا،
طرابلس اور بلقان میں جس طرح مسلمانوں پر تباہی آئی اور کامل چھپڑ
تک بربادی کا جو خوفناک منظر سامنے رہا وہ اس صدی کا ایک
ایسا دل دوز اور جگر سوز واقعہ ہے جو مسلمانوں کو صدیوں خون
رلائے گا۔ ان حالات میں ناممکن تھا کہ مولانا حالی کا دل جو عمر
بھر ایک ایک مسلمان خاندان کی تباہی و بربادی پر روتا رہا ہو بیتاب

و مضطرب ہو جاتا وہ روزانہ جنگ کی خبریں سنتے اور بے قرار ہو جاتے اور دل کا درد آنکھوں سے قطرات اشک بن کر ٹپکتا۔ کئی مرتبہ زبان سے اس مظلومانہ آرزو کا بھی اظہار ہوا کہ دو اطمینان دہ وقت بھی کبھی آئے گا جبکہ ترک اور ایرانی کے قتل و خون کے بجائے ہم یہ سنیں گے کہ آج اتنے جرمن مارے گئے اور اتنے روسی کام آئے، ایک خانگی خط میں لکھتے ہیں کہ:-

یہ دھڑکی کی خبریں جو آجکل آ رہی ہیں انہوں نے بالکل کمزور دی ہے ایران اور مراکو کی توفاتہ خیر پڑ چکے تھے اب ٹرکی کی بھی بظاہر خیر تحقیق معلوم ہوتی ہے لعل اللہ یحدث بعد ذلک امرا“

ان کا دل ہر اس شخص کی محبت سے معمور ہو جاتا جو ان مظلوموں کی ہمدردی و اعانت میں کوئی آواز بلند کرتا یا کوئی عملی تحریک کر سکتا تھا ان ہی جذبات سے متاثر ہو کر مولانا ظفر علی خان کی ان کوششوں کی نسبت جو انھوں نے طرابلس و بلقان کے شہیدوں اور مجروحوں کی ہمدردی میں کی تھیں مولانا نے ”شکریہ مساعی جمیلہ ظفر علی خان“ کے عنوان سے یہ مخصوص نظم لکھی تھی۔

شکرِ یساعی جمیلہ ظفر علی خان

اے مالکِ فتنہ زیندار	اے نازشس قوم و فخرِ اقران
اے روحِ روانِ جمیعِ احباب	اے چشمِ دجراغِ یزمِ اخوان
اے دین کے امتحانِ بینِ جانِ باز	اے نصرتِ حق میں تیغِ عیان
اے صدق و صدا کی زندہ تصویر	اے شیرِ دل، اے ظفرِ علیخان
قدرتِ بھرے تھے تجھ میں جو گن	جب تک وہ رہے نظر سے پہنان
فوقیت و برتری پہ تیری	و تا کم کوئی ہو سکی نہ برہان
بروقت کی تاک میں برابر	ہمت تری گن رہی تھی گھڑیاں
بلقان و طرابلس میں ناگاہ	اٹھا ستم و جفا کا طوفان
ہمدردی اہل دین نے تیرے	جو ہر ترے کر دئے نمایاں
جمعیت و صمد کا سرا سر	داسن ہوا چاک تا گریبان
پھیلے وہ بشکلِ سیلِ آتش	دل میں ترے جو شررتے پہنان
ڈالا یہ تری پکارنے غل	جی اٹھے وہ مردے جو تھے بے جان
جو دلِ غمِ قوم سے تھے بے حس	چلنے لگیں اُن دونوں پہ چھریاں
وہ بن گئے آپ اپنے رہن	جو مال کے اپنے تھے نگہبان

اسلام کی سمجھ اب حقیقت
 جو نام کے تھے فقط مسلمان
 ہاں اس میں بھین مبالغہ کچھ
 سنتا ہی ہے اے ظفر علی خان
 نازان ہے وہ درگاہ تجھ پر
 تعلیم پر جس کی تو ہے نازان
 کاش ایسے جنے سدا وہ فرزند
 جو قوم کے درد کے ہوں درمان
 جو قوم کے نام پر ہوں قربان
 سوز غم دین حق سے جن کے
 سینے ہوں کباب دل ہوں بریا
 جو ملک و وطن کے ہوں فدا
 مشرق میں ہوں درد دلے چین
 پنجاب کو تجھ پہ ہوا اگر فخر
 مغرب میں سینیں جو رنج اخوان
 ہے اس کو یہ فخر و ناز شایان
 زندہ ہے وہ ملک اور وہ ملت
 ہوں زندہ دل ایسے جس میں انسان



اسی طرح مولانا محمد علی کی اُن کوششوں کی جو اُفقوں نے
 جنگ بلقان کے زمانہ میں طبی و فدیہ دہی کی تھیں مولانا
 حالی کے دل میں بڑی قدر و منزلت تھی جس کا اظہار اُفقوں
 نے اخبار بہارِ رد کے اجرا کے موقع پر اس طرح کیا تھا۔
 تمغوں کی ہوس نہ یاں خطابوں کی طلب اک ملک کی خدمت کا ہر سودا یار
 ہمدرد کو اسم با اسم کیجو اس نام کی لاج تیرے ہی ہاتھ ہو یا

مولانا کی نصائفت و معنائین، شاعری اور عام قابلیت پر تبصرہ کرنا درحقیقت ایک ایسے قابل آدمی کا کام ہے جو مولانا کا کاہم پلہ ہو اور مولف تذکرہ ایسی قابلیت سے محض عاری ہی ہو البتہ تذکرہ کی تکمیل کے لیے ان کا ایک مختصر بیان ضروری ہے اور اسی کو پیش نظر رکھا ہے۔

سلسلہ نظم میں مولانا کے مسدس مد و جزر اسلام کے علاوہ محبت سی نظمیں اور مسدس - ترجیع بند، رباعیان، او قطعات وغیرہ کی شکل میں ہیں۔ جن کی الگ الگ اور مجموعہ کے طور پر بہ کثرت اشاعت ہوئی ہے ان نظموں میں، برکھارت، نشاط، امید، حب وطن، مناظرہ رحم و انصاف، مناجات بیوہ شکوہ ہرند - حقوق اولاد، مستقل مثنویان ہیں جو جن بیان خوبی معنائی اور جذبات سے لبریز ہیں لیکن اس سلسلہ میں مناجات بیوہ کامر تہ سب سے بلند ہے۔ اور اس میں جو درد بھرا ہوا ہے یہی نہیں کہ اس کا اندازہ سب سے زیادہ بد نصیب بیواؤں کو ہو یا وہ لوگ جنہوں نے بیوگی کی معیشت کو غور سے دیکھا ہے اس درد کا کچھ اندازہ کریں بلکہ ہر پڑھنے والے کا قلب

اس درد سے بے چین ہو جاتا ہے اور خاص کر صغریٰ کی شادی کے
 ہولناک نتائج جو اس میں نمایاں ہیں بے حد موثر ہیں اور وہ اس قدر
 مقبول ہوئی کہ اس کا ترجمہ علاوہ دس زبانوں کے اعلیٰ سنگت
 میں بھی ہو گیا ہے۔

مولانا کو تعلیم نسوان کے ساتھ خاص دلچسپی تھی اور عورتوں کی
 اس زار حالت سے جو موجودہ سوسائٹی میں تھی ان کے دل کو
 تکلیف پہنچتی تھی یہی درد اور تکلیف تھی کہ جس کے اثر سے
 مولانا نے وہ مشہور نظم جو دو چپ کی داد، کے نام سے
 معروض ہوئی لکھی۔

اس نظم کے علاوہ ان خیالات و حالات سے جو لڑکیوں کی
 نسبت ناتے اور شادی بیاہ میں برکی تلاش و انتخاب میں پیش
 آتے ہیں متاثر ہو کر انھوں نے ایک اور مختصر نظم بھی لکھی تھی
 جو ان کے دردِ دل کو ظاہر کرتی ہے۔

۱۸۹۰ء میں خود مولانا نے مجموعہ نظم حالی کے نام سے
 ایک مجموعہ شائع کیا جس میں متذکرہ بالا قسم کی نظموں میں
 سے ۴ نظمیں ہیں یہ اس اڈیشن کو ۱۸۹۳ء میں مولانا وحید الدین
 سلیم نے بعد کی کسی ہوئی نظموں کا اضافہ کر کے پانی پت سے

شایع کیا۔

مولانا کی قدیم و جدید غزلیات کا مجموعہ بھی ”دیوان حالی“ کے نام سے ۱۹۳۷ء میں شایع ہو گیا ہے اور اس میں شعر و شاعری پر ایک مبسوط مقدمہ ہے جو بجائے خود ایک مستقل کتاب کی حیثیت رکھتا ہے یہ مقدمہ برسوں کی جھان بین، کدوکاوش اور غورو مطالعہ کا نتیجہ ہے مقدمہ کے بعد پچھلے کچھ قطعات ہیں جو چند موعظت اور وعظ و نصیحت سے معمور ہیں، پھر جدید قدیم غزلیات ہیں اور پھر تنو کے قریب حکیمانہ رباعیات ہیں، اخیر میں قصائد، مسدس، ترکیب بند، مرثیے، اور کچھ قطعات اور تاریخیں ہیں اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۴۸ء میں حالی بک ڈپو نے پانی پت سے اور الناظر بک ایجنسی نے لکھنؤ سے شایع کیا حالی بک ڈپو نے رباعیات کا مجموعہ اور متفرق نظموں کو جواہرات حالی کے نام سے الگ الگ بھی شایع کر دیا ہے لیکن افسوس ہے کہ ان مجموعوں میں پھر بھی بہت سی دلچسپ اور مفید نظمیں نہیں ہیں اور اس بات کی ضرورت ہے کہ ایک مکمل مجموعہ آب و تاب کے ساتھ شایع کیا جائے۔ بعض نظمیں ایسی بھی ہیں کہ جن کا حق تصنیف مولانا نے کسی قومی انٹی میوشن کو دیدیا ہے ان کا حق محفوظ

۴۵
رہنا چاہیے کیونکہ وہ ایک خیر جاریہ ہے لیکن اگر کل مجموعہ شایع
کیا جائے تو ان النسی ٹیوشنوں کو اس میں حصہ رسدی شریک
ہونا چاہیے۔

مولانا کے مدحیہ قصائد میں بھی ایک خاص رنگ ہر بے سرو پا
مدح سرائی اور بھٹی سے ان کو سخت نفرت ہو گئی تھی وہ اعلیٰ
حضرت نظام الملک آصفیاء سادس مرحوم و مغفور کے جتن جوہلی
میں قصیدہ پیش کرنے کی تیاری کرتے ہیں لیکن اپنے دوستوں سے
واقعات طلب کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ جو مدح ہو وہ واقعات
پر مبنی ہو۔

اعلیٰ حضرت نظام الملک آصفیاء سابق خلد اللہ ملکہ جب
مسند حکومت پر جلوہ افروز ہوئے ہیں تو مولانا نے بھی قصیدہ
تہنیت پیش کیا ہے لیکن اس وقت تک ایسے اہم واقعات ہی
نہ تھے کہ مولانا کی مدح سرائی ان پر مبنی ہوتی لیکن چونکہ وہ تو
تلامذہ الرحمن کے زمرہ میں شامل تھے اس لئے ان کے اس قصیدہ میں بھی ایک
عجیب طرز اور رنگ ہے جسکی مثال تقدیر شکر کلام میں نہیں مل سکتی مثلاً اشعار ذیل ملاحظہ ہو
فلک مرتبت میر عثمان علی خان مبارک تہمین مسند شہر یاری
مبارک ہو تم کو وہ دشوار منزل جہان چپہ چپہ پہ ہے ذمہ داری

مبارک بزرگوں کی میراث تم کو
 جنہوں نے کہ جھیل میں کرپاں ماری
 اب ان کی جگہ آپ کو ہو اٹھانا
 خدا کی امانت کا یہ بوجھ بھاری
 جو بے بس ہیں دنیا ہو ان کو ہمارا
 جو بے یار ہیں ان کی کرتی ہے یا
 نکمے جو ہیں ان کو کامی بنانا
 بڑھانا دل ان کا جو ہیں کا زور یا
 جگانا انھیں نیند کے ہیں جو مانے
 پڑھانا انھیں علم سے جو ہیں عار

مولانا نے لغت میں بھی چند غزلین رباعیان اور قصیدے
 لکھے ہیں لیکن ان میں بھی ایک خاص طرز اور ایک ایسا
 رنگ ہے جو حالی کے لیے ہی مخصوص تھا۔

مولانا کی رباعیان جو جذبات اور حکمت و موعظت کے
 سرچشمے ہیں نہ صرف ہندوستان میں مقبول ہوئیں بلکہ ان
 کو ایک قابل انگریز مسٹر وارڈ نے انگریزی میں ترجمہ کر کے
 یورپ میں شائع کیا اور وہاں انھوں نے قبولیت حاصل کی۔
 مولانا کے فیوض و برکات سے نادان چھوٹے بچے بھی محروم
 نہیں رہے اور ان کی سمجھ کے مطابق ان کے جذبات ابھارنے
 کے لئے متعدد نظمیں لکھیں۔

مولانا کی بعض نظمیں مخصوص قومی انٹی میوشنوں کے لیے
 ہوتی تھیں اور بعض کا حق تصنیف کسی انٹی میوشن کو مرحمت

کر دیتے تھے۔

اسلامیہ ہائی اسکول اٹاواہ کے ساتھ اُن کو خاص دلچسپی تھی اور بانی مدرسہ کی بے لوث خدمات کے بڑے معترف تھے۔ وہ محمدن کالج کے بعد تمام اسلامی مدارس میں سب سے زیادہ اسی اسکول کو مسلمانوں کے لئے مفید خیال کرتے تھے اور اُن کی رائے تھی کہ کم استطاعت مسلمانوں کے بچوں کے لیے اس اسکول سے بہتر کوئی دوسرا اسکول نہیں کیونکہ جو فواد محمدن کالجیٹ اسکول علیگڑھ میں امریکہ کے بچے حاصل کر سکتے ہیں وہ سب خوبیاں اسلامیہ ہائی اسکول اٹاواہ میں کم استطاعت شریف مسلمانوں کے بچوں کے لیے موجود ہیں چنانچہ جب اس اسکول کے ساتھ بورڈنگ ہاؤس قائم کیا گیا ہے جس میں ابتداً دس پندرہ بچوں سے زیادہ بورڈرز نہ تھے تو مولانا نے اپنے پوتے کو اسی اسکول میں تعلیم کی عرض سے بھیجا تھا۔

مولانا نے مدرسہ کی امداد کے لیے ۱۹۳۳ء کی دھلی کانفرنس کی مشہور نظم ”دو تحفۃ الاخوان“ کا حق تصنیف مرحمت فرمایا جس کو منشی رحمت اللہ رحمہ اللہ مرحوم بالکب نامی پریس کانپور نے

۴۸
 کھایت نفاس کے ساتھ طبع کر کے شایع کیا۔ اس کے بعد دوسری
 نظم کا حق بھی جس کا نام ہے ترقی و منزل، ہے عطا کیا۔ نظم کے
 علاوہ نثر میں بھی مولانا کا مرتبہ بہت بلند تھا وہ ہے تہذیب الاخلاق
 کے بلند پایہ مضمون نگار تھے اس کے علاوہ متفرق طور پر
 بھی کبھی کبھی مضامین لکھتے رہتے تھے۔ تصانیف پر ان کا
 طرز تبصرہ، ریویو نگاری کا ایک نمونہ تھا انھوں نے متعدد
 کتابوں پر ریویو لکھے ہیں اور ان سے مولانا کے علم و فضل
 اور وسیع النظری کا پورا اندازہ ہوتا ہے۔

نثر میں ان کی پہلی مستقل کتاب دو تریاق مسموم، مذہبی
 مناظرہ میں ہے یہ کتاب ایک خاص اثر میں لکھی گئی ہے
 مولانا کے وطن میں ایک قابل آدمی ملاخیز الدین اور ان کے
 بیٹے عیسائی ہو گئے تھے مگر پھر انھوں نے اور ان کے ایک
 بیٹے نے اسلام اختیار کر لیا لیکن ایک بیٹا عماد الدین
 بدستور عیسائی رہا یہ عربی بھی جانتا تھا اور مشن میں ملازم ہو گیا
 تھا اس نے ایک کتاب فی ہدایتہ المسلمین، کے نام سے

۵۱ یہ کل مضامین مولانا سید وحید الدین سلیم نے ایک مجموعہ کی
 شکل میں شایع کرائے تھے۔ لیکن اب نایاب ہیں۔

لکھی تھی اور اس کے جواب میں مولانا نے یہ کتاب لکھی۔
 اسی طرح پادری نے مذکور کی کتاب دو تاریخ محمدی،، پر ایک تبصرہ رسالہ
 کی صورت میں لکھا ہے اور آن حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
 کے متعلق جو کچھ پادریوں نے لکھا ہے اُس کا فلسفی اور غیر متعصب
 یورپین کی رائے سے مقابلہ کیا گیا ہے۔

اسی ابتدائی زمانہ میں ایک کتاب جو فرانسیسی سے عربی میں
 ترجمہ کی گئی ہے اور طبقات الارض پر لکھی عربی سے اردو میں
 ترجمہ کیا تھا اور گویا اُحفون نے اس طرح اردو زبان کو ایک علمی
 زبان بنانے میں اس وقت سعی کی جب کہ ترقی اردو کے
 خیال کا دماغوں میں پتہ تک نہ تھا۔

مولانا کو تعلیم سنوان کے ساتھ اس وقت سے پہلے ہی دلچسپی تھی
 جبکہ ہمارے مصلحین قوم اس موضوع پر بحث کر رہے تھے اور
 اس دلچسپی کا اعلیٰ ثبوت اُحفون نے اس طرح دیا کہ عورتوں کے
 پڑھنے کے لیے ایک کتاب دو مجالس النساء،، تصنیف کی جو کچھ
 عرصہ تک پنجاب کے مدارس میں داخل مضامین رہی اور خانگی تعلیم
 میں اس سے فائدہ حاصل کیا گیا اور دہلی کے متعدد خاندانوں
 میں یہی کتاب تعلیم سنوان کا سبب ہوئی اس کتاب کے مصلحین تعلیمی

دربار دہلی کے موقع پر مولانا کو چار سو روپیہ کا انعام بھی گورنمنٹ کی جانب سے لارڈ نارکھ بروک نے عطا کیا۔

سلسلہ امین دہ حیات سعدی، لکھ کر جدید قسم کی سوانح عمریوں کی بنیاد مشرقی ادب میں ڈالی اور سلسلہ امین یادگار غالب شائع کی جو مرزا غالب کی نہایت دل چسپ سوانح عمری اور ان کے کلام کی تفسیر ہے۔

اُردو نثر میں ان کی آخری تصنیف دہ حیات جاوید، ہے جس کی ابتدا سلسلہ امین سرسید کی زندگی میں کی تھی اور چھ برس میں باوجود متعدد مرتبہ بیماریوں میں مبتلا ہونے کے اس کو ختم کیا اور نہایت آب و تاب کے ساتھ منشی رحمت اللہ رحمہ اللہ کے نامی پریس کا پتھر میں طبع کرایا۔

سید کی قومی خدمات اور احسانات کا اقتضا تو یہ تھا کہ ہر طرف سے اور ہر طرح سے اُن کی لائق لکھتے ہیں مولانا کو مدد ملتی لیکن کسی متفلس نے قلم سے یا دِرم سے مولانا کو براہ راست مدد نہیں دی۔ کسی زندہ شخص کی یا ایسے شخص کی جس کو انتقال کے ہوئے بھت قریب عرصہ گزرا ہو اور جس کی شاندار زندگی بہت طویل و عریض ہو، وہ ادیب و مصنف ہو اور ساتھ ہی زبردست

اسپیکر، تمدن و معاشرت اور مذہب کا مصلح اور مجدد ہو، ملکی سیاست میں ایک مدبر کا مرتبہ رکھتا ہو۔ غرض اسکی مختلف النوع حیثیتیں ہوں اسکی ذات اور اس کے کاموں کے متعلق مخالفت و موافق رائیں رکھنے والے بھی موجود ہوں اس کے کاموں کا سلسلہ ہندوستان سے انگلستان تک وسیع ہو۔ ایسی صورت میں اسکی لائف کا مواد جمع کرنا، پھر اسکی ترتیب اور اس کو لکھنا ایک زہرہ گداز کام تھا مگر مولانا نے تنہا اس عہد کو سر کیا اور اس طرح کہ اردو ادب میں ایک ایسی حسیۃ کا اضافہ کیا جو اپنی نظیر آپ ہی ہے۔

اس کتاب کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصہ میں جو ۲۰ صفحہ کا ہے۔ سرسید کے حالات زندگی ہیں دوسرے حصہ میں جو ۵۵ صفحہ کا ہے سرسید کی لائف، اُن کی تصانیف اور اُن کے کاموں پر ریلو کیا ہے اور یہ حصہ حقیقت میں مولانا کی محنت و دماغ سوزی کا تامشا گاہ ہے بقول مولانا حبیب الرحمن خان صاحب شروانی (نواب صدر یاجنگ بھادر)

”اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ مولانا نے مصافحت غور اور فکر کے ساتھ سرسید کے ہر ایک کام کو خواہ عملی ہو

یا علی دیکھا ہے اُن کی تصانیف کے ہزاروں صفحے بڑھ کر اُن کے
مضامین کے ماسٹر بنے ہیں اور اس کے بعد پوری کاوش سے
ان پر ساڑھے پانچ سو صفحوں میں اس طرح ریلو کیا ہے کہ اس کے
مطالب بالاجمال محاسن بالتفصیل ناظرین کے سامنے آشکارا
کر دئے ہیں۔

قصہ مختصر سید کی ساٹھ برس کی جانفتا بیون کے کارنامے
صفحات کا غزبریون نمایاں کر دئے ہیں جیسے ایک تین دست مہو
میلون میں پھیلے ہوئے معرکہ کی تصویر چہند انچھ کا غزیر
مشاہدہ کر دیتا ہے۔“

مولانا نے سرسید کے اہم مضامین کو بھی ایک مجموعہ کی شکل
میں طبع کرانا چاہا تھا اور اُس کی تدوین بھی شروع کر دی تھی
لیکن سرسید نے اصرار کے ساتھ منع کر دیا اور مولانا نے مجبور
ہو کر اس ارادہ کو ترک کیا۔

انفون نے نواب مصطفیٰ خان صاحب شیفتہ کے فارسی دیوان کا
مجموعہ مرتب کر کے طبع کرایا۔ اور اُس پر ایک دلچسپ دیباچہ
لکھا اور اس طرح اپنے استاد کا حق ادا کیا۔ مولانا کے خطوط کا
مجموعہ بھی دو حصوں میں حالِ باب ڈپونے شائع کیا ہے جو نہایت

دلچسپ ہے اور اگر غور کیا جائے تو ایسا ہی مجھ پر صلی لائف اور صلی سیرت ہوتی ہے

چونکہ مولانا کو فارسی سے فطری مناسبت تھی اور غدر سے پہلے تک دہلی میں جو علمی صحیحین تھے ان کا بھی یہی مذاق تھا اس لیے مولانا کا مذاق فارسی میں بہت اعلیٰ وارفع ہو گیا تھا۔ ایک زمانہ میں مختلف اردو کتابوں کے بعض مضامین کا جو انگریزی سے ترجمہ ہوئے تھے انہوں نے فارسی میں ترجمہ کیا تھا۔ کبھی کبھی کسی عزیز یا دوست کو فارسی میں خط بھی لکھتے تھے۔ انھوں نے فارسی میں حکیم ناصر خسرو کی سوانح عمری لکھی ہے

ناصر خسرو کے مختصر حالات فارسی تذکروں میں موجود تھے۔ لیکن اس کی مفصل سوانح عمری یکجا نہ تھی مولانا نے نہایت کاوش اور تحقیقات سے مکمل سوانح لکھی۔ چنانچہ اسکے متعلق ۱۳ فردی مسئلہ کے ایک خط میں مولوی عبدالرزاق صاحب معنی البراکہ کو تحریر فرماتے ہیں ناصر خسرو کا سفر نامہ یا اس کا ترجمہ چھاپنے کی اجازت یا ممانعت کرنے کا مجھے کچھ حق نہیں آپ ضرور اس کا ترجمہ چھاپے مگر اسمین نوٹوں کی بہت ضرورت ہوگی امید ہے کہ آپ اس فرض کو بخوبی انجام دیں گے۔ میں نے جو اس کے اول میں ناصر خسرو کا حال فارسی میں لکھا ہے اس میں سخت سخت

جکے ساتھ حکیم موصوف کا سفر نامہ بھی ہے جو ۸۲۰ھ میں شائع ہوئی ہے اس کے علاوہ نشر کے اور بھی نمونے ہیں جو زیادہ تر

دو ادین کی تقاریر کی صورت میں ہیں

فارسی نظم بھی لکھتے تھے۔ ان نظموں میں بہر عربی امیر حبیب اللہ شاہ افغانستان کے درود کا لڑکے موقع پر جو قصیدہ مولانا نے

لکھا تھا وہ ہر اعتبار سے بے بدل ہے اس میں بھی مولانا کا خاص رنگ موجود ہے اور بیجا مدح سرائی سے احتراز کیا گیا ہے۔

مولانا نے ایک ال نامہ بھی شروع کیا تھا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ وہ ختم نہیں ہوا۔ اس میں کے چند جملے انھوں نے ۱۲۸۹ھ میں

مولوی عبدالحق صاحب بنی اسے معتبرا انجمن ترقی اردو کو ایک خط میں لکھے تھے جو اس موقع پر دلچسپی کے لئے ہی نہیں

بلکہ مولانا کے خیالات پر عبور حاصل کرنے کے لئے درج کئے جاتے ہیں

بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۳۔ اور تلاش مجھ کو کرنی پڑی ہے میں بہت خوشی سے اجازت

دیتا ہوں کہ آپ کے نزدیک اگر وہ تحقیقات صحیح ہوں تو اس کا ترجمہ بھی سفر نامہ

کے اول میں چھاپ دیکھئے، مولانا نے اس خط میں مولوی عبدالرزاق صاحب

کو جو ہدایت کی تھی اکھبر اللہ کہ اس کے مطابق انہوں نے سفر نامہ کا ترجمہ کیا

اور تمام کتاب پر مقصّل نوٹ لکھے اور یہ سفر نامہ عنقریب پریس میں جانے والا ہے۔

وہ خود فرمائے ہیں۔

اس میں ہر فرقہ اور ہر گروہ پر چوڑا ہے اور ہر لطیف پیرایہ بین فیکٹس بیان کئے گئے ہیں۔

(۱) المذہب، اعلان جنگ (۲) الدین، تقلیدِ ابا و اجداد
(۳) العلم، قسمی از جہلِ مرکب (۴) الامتحان، آزمائش
لیاقتِ امتحان (۵) البیوٹیورٹی، کارخانہ کلوک ساز (۶)
المسلمان ہند، چون مارگزیدہ از رسیان ترسندگان (۷) العلیگڑہ
پارٹی، شہیدِ وفا (۸) العلیگڑہ کالج، پرورش گاہِ طفلانِ بدست
مائندران (۹) الانجمنِ ہائے اسلامیہ، سبڑہ یرشگال (۱۰)
الاتفاق در مسلمانان، چون اجتماع در نقیضین (۱۱) المرئس۔
آنکہ از ریاست بے خبر باشد (۱۲) الامیر۔ آنکہ تھمیدست و قرعندار
باشد (۱۳) المولوی، آنکہ مسلمانان را از دائرہ اسلام خارج
کے کردہ باشد (۱۴) الواعظ، آنکہ در تفریق بین المسلمین
خطانہ کند (۱۵) الشکار، بھانہ آدم کشی، الکیشن، وجہ
موجب برائے فیصلہ یک طرفہ (۱۶) النیشنل کانگریس، در حق تعلیم ہند
چون بغاوتِ سلسلہ ۶ در حقِ سلسلہ اہل ہند

مولفنا کو عربی علم ادب کا شوق جہاں تک آبا دین پیدا ہوا اس کی نسبت خود
 تحریر فرماتے ہیں کہ ”ادب عربی کسی باقاعدہ استاد سے نہیں پڑھا تھا
 نہ کسی ادیب کے اصلاح لی تھی مگر چونکہ لٹریچر سے فی الجملہ مناسبت
 حقی لغات کی مدد سے آسان آسان کتابیں دیکھنے لگا اور فارسی اردو
 کے علاوہ عربی نظم و نثر میں بھی جتنا فہمنا خامہ زبانی کرتا رہا اس
 مطالعہ سے ان کو عربی علم ادب پر بھی کافی قدرت حاصل ہو گئی تھی
 اور چونکہ مصروف و غیورہ میں جو نئی کتابیں شائع ہوتی تھیں ان کو
 منگواتے اور دیکھتے رہتے تھے اس لئے ان کا عربی ادب بہت بلند ہو گیا
 عربی میں شعر بھی کہتے تھے لیکن کم البتہ نثر کا حصہ زیادہ تھا ۱۸۹۲ء
 میں ”حیات جاوید“ کی تصنیف کے ساتھ ہی ساتھ سریہ کے بڑے
 بڑے کام اور کسی قدر ان کی زندگی کا حال عربی میں بھی لکھنا شروع
 کیا تھا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ مختلف اسباب سے وہ اس کام کی
 تکمیل نہ کر سکے۔

۱۹۱۳ء میں جبکہ ان کو زندگی کی طرف سے ایک حد تک مایوسی
 ہو گئی تھی انھوں نے اپنے فارسی اور عربی کلام کا مجموعہ بریس میں طبع ہو
 کے لئے بھیجا تھا۔

اس شہرت علمی اور قبولیت عام کے علاوہ جو مولانا کو علمی حلقوں میں

۵۷
 ہی نہیں بلکہ طبقہ عوام میں بھی حاصل تھی سلطنت کی طرف سے ہی انکی
 عالمانہ قابلیت اور علمی خدمات کی قدر شناسی کی گئی اور سن ۱۹۷۷ء میں
 ان کو "وشمس العلماء" کا خطاب عطا کیا گیا۔

(۶)

ان خدمات قومی کے ساتھ مولینا نے اپنے وطن میں جو تعلیمی خدمات انجام
 دیں وہ بھی نہایت قیمتی ہیں اس سے تو کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ علی العی
 قصبات میں ہاشرفا کی آبادی زیادہ ہوتی ہے اور ان کی تباہی بربادی
 کے نظارے بھی وہیں زیادہ نظر آتے ہیں پانی پت کی قدیم عظمت سے
 قطع نظر کر کے اس وقت بھی وہ ایک مشہور قصبہ ہے جہاں زیادہ تر
 شریف خاندان آباد ہیں اور ہمیشہ وہاں درس و تدریس کا سلسلہ
 جاری رہا ہے وہاں کے حفاظ تمام ہندوستان میں مشہور ہیں لیکن
 انگریزی تعلیم کا بجز چند گھروں کے چرچا نہ تھا اور اگر ہوتا بھی تو
 پانی پت سے باہر ابتدائی تعلیم کے مصارف کا تحمل ناممکن تھا
 مولینا نے اس کمی اور نقصان کو محسوس کر کے اپنی ذاتی سعی و کوشش
 سے سن ۱۹۷۷ء میں ایک پبلک اسکول قائم کیا اور جب اس کی طرف
 سے کسی قدر اطمینان ہوا تو باشندوں میں علمی مذاق قائم رکھنے کے لئے
 ایک پبلک لائبریری کی بنیاد ڈالی اور عرصہ تک اس کا انتظام اپنے ہاتھ

میں رکھا اور ہمیشہ نادور اور عمدہ کتابیں اسکے لیے فراہم کرتے رہے۔
جب مڈل اسکول اچھی طرح چلنے لگا تو اس کو ہائی اسکول کے درجہ پر پہنچانے
کی کوشش کی چندوں کی جودلی اور سرمایہ کی فراہمی کے لئے قرب جوار
کے مقامات کے دورے کئے اب وہ حالی میموریل ہائی اسکول کے نام
سے قائم ہے اور ان کے قابل فرزند خواجہ سجاد حسین صاحب کی نگرانی
میں کامیابی کے ساتھ چل رہا ہے۔

مولانا کو مسند لڑکوں کی ہی تعلیم اور حالت پر توجہ نہیں تھی بلکہ
وہ لڑکیوں کی تعلیم کو بھی ضروری جانتے تھے اپنے خاندان کی
لڑکیوں کو تعلیم دلانے پر اکثر اپنے اعزاء کو توجہ دلاتے رہتے تھے
لیکن اس طرح جدا جدا سرگرمیوں کا انتظام بہت مشکل تھا
اس لئے انھوں نے ۱۹۵۹ء میں ایک زمانہ مدرسہ بھی قائم کرایا
اور اس کا انتظام و اہتمام اپنے ہاتھ میں رکھا

(۷)

مولانا نے ایک عرصہ تک مختلف امراض میں مبتلا رہ کر کبھی کم
اور کبھی زیادہ تکالیف اٹھائیں علالت بھی ہوتا رہا، لیکن اقتصار
عمر کے ساتھ امراض کے سلسلہ میں اضافہ اور شرت ہی ہوتی رہی
اور آخر ۱۹۷۱ء میں دودن کی سخت تکلیف کے بعد قرآن مجید سنتے

ستے (۳۱) محرم ۱۰۳۷ھ ۳۱ دسمبر کو ادنیٰ روح نے داعی اہل کو
لیک لکھا اور انہوں نے اس دردِ عالم سے نجات حاصل کی
جس نے ۱۰۰ سال سے اون کے رگس و پے میں سرت
کر لی تھی اور اون کے وجود کو درو کا ایک بجمہ بنا دیا تھا۔ ہر قوم
سنا زبنا زہ کے بعد جس میں شہر کے ہر طبقہ کے مسلمان بہ کثرت شریک تھے
پانی پت کی مشہور درگاہ قلندہ شاہ میں دفن کئے گئے۔

حالی کی قبر پر

سید ہاشمی فرید آبادی

اے جسم گرا خاں یہ دلے روح مغرزا
تو دہ کہ ترا طے طے اس بجم گرامی
اُتر کی فضا کو بج گئی تیری لڑا سے
مستاب کی مانند ترے فیض کا پرتو
یہ مسکن عزت تجھے کس طرح سے بھایا؟
اک کشور اعظم کی حدوں میں نہ سما یا
دکھن کی ہواؤں نے ترانہ ترا گایا
ہر سمت گیا پھیل، ہر اک خطے پہ بھایا

کیا چیز تھی اے خالک نشین اتجہ میں کہ جس نے
ورثے میں ملی تھی نہ کوئی جاہ و مارت
ہاں درو کہ ہے بلبیل غم دیدہ کا حصہ
رتبہ ترا افلاک سے رفعت میں بڑھایا؟
کچھ دولت دنیا تھی ترے پاس، نہ مایا
مقوم میں تھا تیرے دلی نرم کے آیا

ہو سکتی نہ تھی در نہ یہ تاثیر جب کہ روز ۶۰
ہر لول میں ہر راگ میں، جو تو نے سنایا

مانا کہ وہ موضوع بہت درد بھرا تھا جس پر قلم نوحہ رقم تو نے اٹھایا
مانا کہ لکھ کر سنئے اس قوم کے تو نے گیتی نے ابھی خاک میں تھا جس کو ملایا
وہ نقش، مگر، عالم نوبت میں بڑی تھی تھا سو گین میں جس کے کوئی اپنا نہ بڑایا
یاد آتے تھے اب میں کے نضا کثر چٹا اس عالم ناقد نے تھا جس کو کھیلایا

ہاں تو نے کیا نام کو اسلام کے زندہ اک عہد فراموش کو پھر یاد دلایا
پھر کیا ہے کہ اک ملت خفہ کو جگا کر خود موت کی جا دہن جو منہ تو نے چہلایا
کیا مشعل رہ کی نین اب ہم کو فروزا کیا ہم پر اب اقبال کا پھر آگیا سایا
کیا مرگ تری شمع شبستان کا ہے بجھنا؟
کیا میں یہ یقین کر لوں کہ وقت سحر آیا؟

کھوپال

زمیری

محرم ۱۰۰ مار ہادی
۲۲ اکتوبر ۱۹۲۵ء

اسلامیہ مانی سکول ٹاؤ

علیگڑہ کے بعد اس صوبہ میں سب سے قدیم اور شہور اسلامی مدرسہ ہے جہاں تعلیم ذہنی کے ساتھ مذہبی اور جسمانی تربیت کا بھی بہترین انتظام ہے۔ ہندوستان کے ہر صوبہ کے طلباء یہاں تعلیم پاتے ہیں۔ دارالاقامہ میں متعدد قابل استاد اور علماء بچوں کی نگرانی اور تعلیم و تربیت کی غرض سے ان کے ساتھ رہتے ہیں۔ مفصل حالات کے لئے دستور العمل طلب فرمائے۔

محمد الطاف حسین بی اے (علیگ)

ہیڈ ماسٹر

سید

1915/14

(سید)

DUE DATE

R.D. 4
26 2 40
73

Ram Babu Saksena Collection

۱۲۷۹

Kanab High School Collection

0112 1915-1917

12-12-17 12-12-17

Date	No.	Date	No.
R.D. 4	4		